ماہنامہ

اشراق

لاہور

مئی ۲۰۱۸ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

”آدمی کے اندر فتنہ کے جو بڑے بڑے دروازے ہیں، روزہ ان کو بہت بڑی حد تک بند کر دیتا ہے۔ آدمی کے اندر فتنے کے بڑے دروازے، جیسا کہ ایک سے زیادہ حدیثوں میں تصریح ہے، بطن اور فرج ہیں، انھی کے سبب سے آدمی نہ جانے خود کتنی ہلاکتوں میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی نہیں معلوم کتنی ہلاکتوں میں مبتلا کرتا ہے۔ یہی راستے ہیں جن سے شیطان انسان پر سب سے زیادہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان ان کی حفاظت کر سکے تو سمجھیے کہ اس نے اپنے آپ کو دوزخ کے عذاب سے بچا لیا ہے۔“

—— دین و دانش

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگی قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ماہنامہ
اشراق
لاہور

جلد ۳۰ شمارہ ۵ مئی ۲۰۱۸ء شعبان المعظم / رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

فہرست

شذرات

روزہ — جاوید احمد غامدی — ۴

علم کا سفر — سید منظور الحسن — ۷

قرآنیات

البیان: طٰہٰ ۲۰: ۹-۴۱ (۲) — جاوید احمد غامدی — ۱۱

دین و دانش

روزہ اور برکات روزہ — مولانا امین احسن اصلاحی — ۲۵

سیر و سوانح

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۵) — محمد وسیم اختر مفتی — ۳۴

مقالات

حضرت موسیٰ اور حضرت عمر کی شخصی و فکری مماثلتیں — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۴۵

مطلقہ اور بیوہ کی عدت: ایک جائزہ — ؍؍ — ۵۶

قبیلائی تعصّبات: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں — محمد تہامی بشر علوی — ۶۰

نقد و نظر

قصر نماز — محمد حسن الیاس — ۶۹

نقطۂ نظر

کیا جاوید احمد غامدی امت مسلمہ کی اکثریت کی تکفیر کرتے ہیں؟ — ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی — ۷۴

فی شمارہ 30 روپے
سالانہ 300 روپے
رجسٹرڈ 700 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک
سالانہ 30 ڈالر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

شذرات

جاوید احمد غامدی

روزہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسری اہم عبادت روزہ ہے۔ عربی زبان میں اِس کے لیے 'صوم' کا لفظ آتا ہے جس کے معنی کسی چیز سے رک جانے اور اُس کو ترک کر دینے کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں یہ لفظ خاص حدود و قیود کے ساتھ کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان میں اِسی کو روزہ کہتے ہیں۔ انسان چونکہ اِس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اِس لیے اللہ تعالیٰ کے لیے اُس کا جذبۂ عبادت جب اُس کے عملی وجود سے متعلق ہوتا ہے تو پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ روزہ اِسی اطاعت کا علامتی اظہار ہے۔ اِس میں بندہ اپنے پروردگار کے حکم پر اور اُس کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں بعض مباحات کو اپنے لیے حرام قرار دے کر مجسم اطاعت بن جاتا اور اِس طرح گویا زبان حال سے اِس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے حکم سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اگر قانون فطرت کی رو سے جائز کسی شے کو بھی اُس کے لیے ممنوع ٹھیرا دیتا ہے تو بندے کی حیثیت سے زیبا یہی ہے کہ وہ بے چون و چرا اِس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

اللہ کی عظمت و جلالت اور اُس کی بزرگی اور کبریائی کے احساس و اعتراف کی یہ حالت، اگر غور کیجیے تو اُس کی شکر گزاری کا حقیقی اظہار بھی ہے۔ چنانچہ قرآن نے اِسی بنا پر روزے کو خدا کی تکبیر اور شکر گزاری قرار دیا اور فرمایا ہے کہ اِس مقصد کے لیے رمضان کا مہینا اِس لیے خاص کیا گیا ہے کہ قرآن کی صورت میں اللہ نے جو ہدایت اِس مہینے میں

تمھیں عطا فرمائی ہے اور جس میں عقل کی رہنمائی اور حق و باطل میں فرق و امتیاز کے لیے واضح اور قطعی حجتیں ہیں، اُس پر اللہ کی بڑائی کرو اور اُس کے شکر گزار بنو۔

اِس کا منتہاے کمال یہ ہے کہ آدمی روزے کی حالت میں اپنے اوپر مزید کچھ پابندیاں عائد کر کے اور دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر چند دنوں کے لیے مسجد میں بیٹھ جائے اور زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کرے۔ اصطلاح میں اِسے اعتکاف کہا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ رمضان کے روزوں کی طرح لازم تو نہیں کیا گیا، لیکن تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔ روزہ و نماز اور تلاوت قرآن کے امتزاج سے جو خاص کیفیت اِس سے پیدا ہوتی اور نفس پر تجرد و انقطاع اور تبتل الی اللہ کی جو حالت طاری ہو جاتی ہے، اُس سے روزے کا اصلی مقصود درجۂ کمال پر حاصل ہوتا ہے۔

روزے کی تاریخ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نماز کی طرح روزے کی تاریخ بھی نہایت قدیم ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ روزہ مسلمانوں پر اُسی طرح فرض کیا گیا، جس طرح وہ پہلی قوموں پر فرض کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ تربیت نفس کی ایک اہم عبادت کے طور پر اِس کا تصور تمام مذاہب میں رہا ہے۔

روزے کا مقصد

اِس کا مقصد قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ لوگ خدا کا تقویٰ اختیار کر لیں۔ قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے شب و روز کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رکھ کر زندگی بسر کرے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اِس بات سے ڈرتا رہے کہ اُس نے اگر کبھی اِن حدود کو توڑا تو اِس کی پاداش سے اللہ کے سوا کوئی اُس کو بچانے والا نہیں ہو سکتا۔

روزے کا قانون

اِس کا قانون درج ذیل ہے:

روزے کی نیت سے اور محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھانے پینے اور بیویوں کے ساتھ تعلق سے اجتناب ہی

روزہ ہے۔

یہ پابندی فجر سے لے کر رات کے شروع ہونے تک ہے، لہٰذا روزے کی راتوں میں کھانا پینا اور بیویوں کے پاس جانا بالکل جائز ہے۔

روزوں کے لیے رمضان کا مہینا خاص کیا گیا ہے، اِس لیے جو شخص اِس مہینے میں موجود ہو، اُس پر فرض ہے کہ اِس پورے مہینے کے روزے رکھے۔

بیماری یا سفر کی وجہ سے یا کسی اور مجبوری کے باعث آدمی اگر رمضان کے روزے پورے نہ کر سکے تو لازم ہے کہ دوسرے دنوں میں رکھ کر اُس کی تلافی کرے اور یہ تعداد پوری کر دے۔

حیض و نفاس کی حالت میں روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ تاہم اِس طرح چھوڑے ہوئے روزے بھی بعد میں لازماً پورے کیے جائیں گے۔

روزے کا منتہاے کمال اعتکاف ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی شخص کو اِس کی توفیق دے تو اُسے چاہیے کہ روزوں کے مہینے میں جتنے دنوں کے لیے ممکن ہو، دنیا سے الگ ہو کر اللہ کی عبادت کے لیے مسجد میں گوشہ نشین ہو جائے اور بغیر کسی ناگزیر انسانی ضرورت کے مسجد سے باہر نہ نکلے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

آدمی اعتکاف کے لیے بیٹھا ہو تو روزے کی راتوں میں کھانے پینے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن بیویوں کے پاس جانا اُس کے لیے جائز نہیں رہتا۔ اعتکاف کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اِسے ممنوع قرار دیا ہے۔

(الاسلام ۱۰۳-۱۰۶)

سید منظور الحسن

علم کا سفر

[امریکا میں ریکارڈ کیے گئے ''جیو نیوز'' کے پروگرام ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے'' میں جناب جاوید احمد غامدی کی گفتگو سے ماخوذ]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۱۔ علم ایک سفر ہے، منزل نہیں ہے۔ یہ حقیقتوں کو جاننے کا سفر ہے۔ اس میں آپ حقائق کو دریافت کرتے چلے جاتے ہیں۔ جب آپ حقائق دریافت کرتے ہیں تو بہت سی ایسی چیزیں جنھیں آپ حقیقت سمجھتے ہیں، ماضی کا افسانہ بنتی چلی جاتی ہیں۔ اس لیے ہمیں علم کو سفر بنانا چاہیے، منزل نہیں سمجھنا چاہیے۔ علم کو اگر ہم منزل سمجھ لیں گے تو ہم اسے کبھی حاصل نہیں کر پائیں گے۔

۲۔ علم سچائی کے ساتھ محبت کا نام ہے۔ ایک طالب علم اگر مذہب کو، سائنس کو، تاریخ کو، ادب کو اس لیے پڑھتا ہے کہ وہ سچائی کو پا لے تو اس کا سفر درست سمت میں ہے، لیکن اگر وہ ان کا مطالعہ جذبات کو تسکین پہنچانے کے لیے، خواہشات کو پورا کرنے کے لیے، تعصّبات کو سہارا دینے کے لیے یا اپنی مانی ہوئی باتوں کے دلائل تلاش کرنے کے لیے کرتا ہے تو وہ علم کے سفر پر گام زن نہیں ہو سکتا۔ علم کی راہ کا مسافر سچائی کو ہر حال میں دریافت کرنا چاہتا ہے، خواہ وہ سچائی اس کی اپنی ذات ہی کی نفی کر دے۔

۳۔ ہم سب کو علم کا سچا طالب بننا چاہیے۔ سچا طالب علم ہر طرح کے تعصّبات سے بالاتر ہو کر حقائق کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ علم کی دنیا میں داخل ہی وہاں سے ہوتا ہے، جہاں تعصّبات کا کوئی گزر نہ ہو۔ اس کے سامنے ہمیشہ یہ منزل رہتی ہے کہ وہ ممکن حد تک صحیح بات تک پہنچ سکے۔

۴۔ لہٰذا اگر مجھے سچا طالب علم بننا ہے تو مجھے ہر حال میں صحیح بات تک پہنچنے کو اپنی منزل بنانا چاہیے۔ چاہے وہ بات میرے مسلمہ تصورات کو ختم کر دے، چاہے وہ میرا ماضی مجھ سے چھین لے، چاہے وہ میرا حال بدل کر رکھ دے، چاہے وہ میرے مستقبل کی کوئی نئی تصویر بنا دے، مجھے بہر حال اسی کو جاننا ہے، اسی کی خواہش کرنی ہے، اسی کی جستجو کرنی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اپنے تعصّبات اور اپنے ماحول سے اوپر اٹھنا آسان کام نہیں ہوتا۔ میں اب بھی اگر ایک نظر پیچھے ڈال کر دیکھوں تو بارہا ایسا ہوا ہے کہ میرا کوئی تعصب، میرا کوئی ماضی، میرا کوئی جذبہ، صحیح بات تک پہنچنے میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ جو طالب علم ان رکاوٹوں کو دور کرنا شروع کر دے گا تو اس کے علم کے سفر کا آغاز ہو جائے گا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۵۔ ہماری پوری زندگی کو اصل میں اکیڈیمک (academic) طریقے سے گزرنا چاہیے۔ اکیڈیمک (academic) طریقہ میں اس کو کہتا ہوں کہ جب آپ کے سامنے کوئی مسئلہ آئے، کوئی سوال آئے، خواہ وہ ذاتی مسئلہ ہو، خاندانی مسئلہ ہو، قومی مسئلہ ہو یا کوئی علمی یا عملی سوال ہو تو آپ کو اس کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ اُس کے اندر اُتر کر دیکھنا چاہیے کہ یہ بات کہاں سے پیدا ہوئی ہے، اس کی بنیادیں کہاں پائی جاتی ہیں۔ آپ اکثر و بیشتر دیکھیں گے کہ لوگ جس جگہ سے بات اُٹھ رہی ہوتی ہے، اُس سے کئی میل آگے کھڑے ہو کر اُس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۶۔ علم کا راستہ صرف تنقید ہے۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ ایک فلسفی نے بڑی اعلیٰ بات کہی ہے کہ اگر آپ میز پر بیٹھ کر یہ چاہیں کہ آپ دنیا کا بہترین ہسپتال بنالیں تو آپ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے آپ کو ایک دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ آپ دنیا کے تمام ہسپتالوں کا ناقدانہ جائزہ لیں اور دیکھیں کہ اُن میں کیا خامیاں ہیں۔ پھر اپنے ہسپتال میں ان خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح آپ کا ہسپتال دوسرے ہسپتالوں کی نسبت بہتر ہو جائے گا۔ پھر دوسرے لوگ آپ کے ہسپتال کا تنقیدی جائزہ لیں گے اور وہ اُس سے بہتر ہسپتال بنانے کی کوشش کریں گے۔ علوم کا سفر بھی اصل میں اسی طرح آگے بڑھتا ہے۔

۷۔ علم آپ سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ جب آپ اپنی جگہ سے بات کرتے ہیں تو دوسرے کو بھی اس کا حق دیں کہ وہ جہاں کھڑا ہے، وہاں سے بات کر سکے۔ اگر ایک شخص اُس سفر سے، اُس تجربے سے گزرا ہی نہیں جس سے آپ گزرے ہیں تو وہ کیسے آپ سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے؟ ہر فرد جس جگہ پہ کھڑا ہوتا ہے، اُس سے مختلف رویہ نہیں اختیار

کرسکتا۔ جب آپ اس بات کو جان لیتے ہیں تو پھر آپ کو دوسرے کی بات پر غصہ نہیں آتا۔

۸۔ ہمارے ہاں جو سب سے بڑی کمی آ گئی ہے، وہ یہ ہے کہ ہم علم و عمل سے متعلق ہر رائج بات کو عقیدے اور ایمان کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ یہ صرف مذہب کا معاملہ نہیں ہے، ہم سائنس میں بھی یہی کرتے ہیں، فن میں بھی یہی کرتے ہیں، تاریخ میں بھی یہی کرتے ہیں۔ ہمارے استاد نے اگر چھٹی ساتویں میں کوئی چیز پڑھا دی ہے تو ہم قسم کھا لیتے ہیں کہ ہم اس کو کبھی چیلنج نہیں کریں گے۔

۹۔ چیلنج اصل میں سوال سے پیدا ہوتا ہے۔ سوال کو اگر آپ برا سمجھتے ہیں اور کانوں کو ہاتھ لگا کر بھاگ جاتے ہیں تو پھر آپ پر علم کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے افکار کے بارے میں، اپنے عقائد کے بارے میں، اپنے تصورات کے بارے میں، اپنے نظریات کے بارے میں اپنے آپ سے سوال کرتے ہیں، اپنے ماحول سے سوال کرتے ہیں تو اس سے آپ پر علم کا دروازہ کھلتا ہے۔ آپ علم و تحقیق کے سفر پر گام زن ہوتے ہیں۔ پھر وہ فکر، وہ نظریہ، وہ تصور، وہ عقیدہ یا قصۂ ماضی بن جاتا ہے یا ایک علمی حقیقت کے طور پر آپ کے دل و دماغ کا حصہ بن جاتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۰۔ ہم جن مفکرین سے، جن علما سے متاثر ہوتے ہیں، اُن کی باتیں الہامی باتوں کی طرح کبھی صفحۂ دل پر لکھ لی جاتی ہیں، کبھی صفحۂ دماغ پر نقش کر لی جاتی ہیں۔ ان نقوش کو ہم بار بار دیکھتے رہتے ہیں، مگر ایسا نہیں ہوتا کہ وہ ہمارے اندر اتر جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس دریافت کو بعینہٖ لے لیتے ہیں، اسے اپنی دریافت نہیں بناتے، یعنی یہ نہیں جانتے کہ وہ دریافت ہوئی کیسے ہے؟ ہمارے معلم بھی عام طور پر نتیجۂ فکر سے آگاہ کرتے ہیں، جب کہ بتانا یہ چاہیے کہ اس نتیجۂ فکر تک پہنچنے کے لیے انھوں نے کیا طریقے اختیار کیے اور کن مراحل سے گزرے ہیں۔ اصل چیز نتیجۂ فکر نہیں، بلکہ اس تک پہنچنے کا منہاج ہے، طریقہ ہے، پراسس ہے، اپروچ ہے۔

۱۱۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم علم کو مجرد طور پر نہیں، بلکہ شخصیات کے تعلق سے سیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ کوئی شخصیت ہمیں متاثر کرتی ہے۔ ہم اس سے انسپائر (inspire) ہوتے ہیں، پھر اس سے وابستگی اختیار کرتے ہیں۔ یہ وابستگی بسا اوقات جنون کی شکل اختیار کر لیتی، بسا اوقات آپ اسے عقیدت کا نام دیتے ہیں اور پھر اس کی ہر بات کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل ہمارے ہاں عام ہے۔ یہ علم کی راہ کی بڑی رکاوٹ ہے۔ علم کے سفر میں اس سے نجات ضروری ہے۔

۱۲۔ اس سے نجات کا طریقہ یہ ہے کہ ہم جن شخصیات سے سیکھنے اور سمجھنے کا تعلق قائم کریں، انھیں عام انسان سمجھیں۔ یعنی ان کی صلاحیتوں سے مستفید ہوں، ان کی خوبیوں کا اعتراف کریں اور اس کے ساتھ ان کی غلطیوں

اور کوتاہیوں پر بھی نظر رکھیں۔ان میں سے کوئی پیغمبر نہیں ہے، لہٰذا انھیں عقیدت کا مقام دینے کے بجاے احترام کی جگہ دیں۔یعنی ان کی بات کو توجہ سے سنیں، اس پر غور کریں، اس کا دیگر اہل علم کی باتوں سے تقابل کریں، پھر اگر ان کی بات صحیح لگے تو اسے قبول کریں، وگرنہ بصد احترام قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ایک سچے طالب علم کو یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے عام طور پر کہا کرتا ہوں کہ عبادت اللہ کی کریں، عقیدت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رکھیں اور باقی سب کا احترام کریں۔

''...آدمی روزے کی حالت میں اپنے اوپر کچھ مزید پابندیاں عائد کر کے اور دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر چند دنوں کے لیے مسجد میں بیٹھ جائے اور زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کرے۔ اصطلاح میں اِسے 'اعتکاف' کہا جاتا ہے۔یہ اگرچہ رمضان کے روزوں کی طرح لازم تو نہیں کیا گیا، لیکن تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔''

(میزان، جاوید احمد غامدی ۳۵۸)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ طٰہٰ

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَهَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ مُوۡسٰى ﴿۹﴾ اِذۡ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهۡلِهِ امۡكُثُوۡۤا اِنِّيۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا

تمھیں کچھ موسیٰ کی سرگذشت بھی پہنچی ہے؟[9] جب اُس نے (دور) ایک شعلہ دیکھا تو اپنے گھر والوں سے کہا:[10] تم لوگ ذرا ٹھیرو، مجھے آگ سی دکھائی دی ہے۔[11] (میں وہاں جاتا ہوں)،

۹؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اوپر صفات الٰہی کے حوالے سے جو تسلی دی گئی ہے، یہ اُسی کے حقائق اب موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت سے سمجھنے کی تشویق ہے۔ مدعا یہ ہے کہ جو کچھ بتایا گیا ہے، اُسے آپ ایک جلیل القدر پیغمبر کی زندگی اور دعوت کی جدوجہد میں بھی دیکھ لیں جو آپ ہی کی طرح خدا کی کتاب اور شریعت کے ساتھ اپنے مخاطبین کے لیے خدا کا فیصلہ لے کر مبعوث ہوئے تھے۔

۱۰؎ یہ اُس وقت کا قصہ ہے جب موسیٰ علیہ السلام چند سال مدین میں گزارنے کے بعد اپنی بیوی کو لے کر مصر جا رہے تھے۔ قرآن میں دوسری جگہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کے ہاتھوں ایک مصری ہلاک ہو گیا تھا اور وہ اِس اندیشے سے کہ اُن کے ساتھ انصاف کا معاملہ نہیں ہوگا، مصر سے بھاگ کر مدین میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ وہاں اُن

لَّعَلِّیۡٓ اٰتِیۡکُمۡ مِّنۡھَا بِقَبَسٍ اَوۡ اَجِدُ عَلَی النَّارِ ھُدًی ﴿۱۰﴾
فَلَمَّآ اَتٰھَا نُوۡدِیَ یٰمُوۡسٰی ﴿۱۱﴾ اِنِّیۡٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ اِنَّکَ بِالۡوَادِ
الۡمُقَدَّسِ طُوًی ﴿۱۲﴾ وَاَنَا اخۡتَرۡتُکَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا یُوۡحٰی ﴿۱۳﴾ اِنَّنِیۡٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا

شاید اُس میں سے تمھارے لیے ایک آدھ انگارا لے آؤں یا آگ پر (بیٹھے ہوئے لوگوں سے) مجھے راستے کا کچھ پتا مل جائے۔[12] ۹-۱۰

پھر جب وہ اُس کے پاس پہنچا تو آواز آئی: اے موسیٰ، یہ تو میں تمھارا پروردگار ہوں، سو اپنے جوتے اتار دو،[13] اِس لیے کہ تم طویٰ[14] کی مقدس وادی میں ہو۔ اور میں نے تمھیں منتخب کر لیا ہے، لہٰذا جو وحی کی جا رہی ہے، اُس کو توجہ سے سنو۔[15] اِس میں شبہ نہیں کہ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی الٰہ

کی شادی ہوئی اور اپنے خسر کے ساتھ قرارداد مدت پوری کرنے کے بعد اب اُن کے لیے ممکن ہو گیا تھا کہ وہ واپس اپنے لوگوں کے پاس چلے جائیں۔

۱۱؎ اصل میں لفظ 'اٰنَسۡتُ' استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اُنھوں نے آگ کا کوئی جلتا ہوا الاؤ نہیں، بلکہ ایک شعلہ سا دیکھا تھا جو اچانک چمکا اور غائب ہو گیا اور اُن کے سوا شاید کسی اور کو نظر بھی نہیں آیا۔

۱۲؎ دوسری جگہ تصریح ہے کہ وہ یہ انگارا اِس لیے لانا چاہتے تھے کہ اپنے اہل و عیال کو رات بھر گرم رکھنے کا کچھ سامان کر سکیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ سردی کا زمانہ تھا اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ جب وہ وادی طور کے پاس پہنچے تو رات ہو چکی تھی اور اُنھیں راستے کا بھی کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

۱۳؎ اِس سے واضح ہے کہ خدا کی بارگاہ میں جوتے اتار کر حاضر ہونا تواضع کے آداب میں سے ہے، لہٰذا عام حالات میں اِسی کا اہتمام کرنا چاہیے۔

۱۴؎ یہ اُس میدان کا نام ہے جو کوہ سینا کے دامن میں واقع ہے۔ اِس کو مقدس اِس لیے کہا گیا ہے کہ یہاں حضرت موسیٰ اپنے پروردگار کی تجلی اور اُس کے کلام سے نوازے گئے۔ اللہ تعالیٰ زمین کے کسی ٹکڑے یا کسی علاقے کو اپنے لیے خاص کر لیں تو اُس کو تقدس حاصل ہو جاتا ہے۔ سرزمین فلسطین کو قرآن کی سورۂ مائدہ (۵) میں اِسی بنا پر 'الۡاَرۡضُ الۡمُقَدَّسَةُ' کہا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

فَاعۡبُدۡنِیۡ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾ اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ اَکَادُ اُخۡفِیۡہَا لِتُجۡزٰی

نہیں ہے۔[16] سو میری ہی بندگی کرو[17] اور میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام رکھو۔[18] حقیقت یہ ہے کہ
قیامت ضرور آنے والی ہے[19] ــــ میں اُس کو چھپائے رکھنے کو ہوں[20] ــــ اِس لیے آنے والی ہے کہ

۱۵؎ اِس لیے کہ جس منصب پر تم سرفراز کیے گئے ہو، وہ ایک عظیم ذمہ داری ہے اور تمھیں اُس ذمہ داری کو ہر حال میں پورا کرنا ہے۔

۱۶؎ ہر نبی کو سب سے پہلے یہی تعلیم دی گئی، اِس لیے کہ تمام دین کا انحصار اِسی عقیدے پر ہے۔

۱۷؎ توحید پر ایمان کے بعد دین کا پہلا حکم یہی ہے کہ جب اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں تو پھر عبادت بھی اُسی کی ہونی چاہیے۔ اِس عبادت کے بارے میں ہم جگہ جگہ بیان کر چکے ہیں کہ اِس کی حقیقت خضوع اور تذلل ہے جس کا اولین ظہور پرستش کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر انسان کے عملی وجود کی رعایت سے یہی پرستش اطاعت کو شامل ہو جاتی ہے۔ پہلی صورت کے مظاہر تسبیح و تحمید، دعا و مناجات، رکوع و سجود، نذر، نیاز، قربانی اور اعتکاف ہیں۔ دوسری صورت میں آدمی کسی کے لیے خدائی اختیارات مانتا اور مستقل بالذات شارع و حاکم کی حیثیت سے اُس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اللہ، پروردگار عالم کا فیصلہ ہے کہ اِن میں سے کوئی چیز بھی اُس کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتی۔

۱۸؎ ایمانیات میں جو حیثیت توحید کی ہے، وہی اعمال میں نماز کی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات الٰہی کی تذکیر سے خدا کی جو معرفت حاصل ہوتی اور اُس سے اللہ تعالیٰ کے لیے محبت اور شکر گزاری کے جو جذبات انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں یا ہونے چاہییں، اُن کا پہلا ثمرہ یہی نماز ہے۔

۱۹؎ اثبات قیامت کے پہلو بہ پہلو اُس کی قطعیت پر یہ زور اِس لیے ہے کہ بالعموم لوگ اُس کو مستبعد سمجھتے رہے ہیں۔ اُنھیں کسی طرح باور نہیں آتا کہ مرنے کے بعد جب مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔

۲۰؎ یہ الفاظ آیت کے بیچ میں بطور جملۂ معترضہ کے آئے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... یہ جملۂ معترضہ نہایت بلیغ ہے۔ صرف یہ نہیں فرمایا کہ میں قیامت کو چھپائے رکھوں گا، بلکہ فرمایا کہ قریب ہے کہ میں اُس کو چھپائے ہی رکھوں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ لفظ 'اَکَادُ' سے جملے کے اندر یہ مضمون پیدا ہو گیا ہے کہ ہر چند میں نے تو ابھی قیامت پر پردہ ڈال رکھا ہے اور یہ پردہ ابھی ڈالے ہی رکھوں گا، لیکن خود قیامت کا یہ حال ہے کہ وہ بے نقاب ہو جانے کے لیے بالکل بے قرار ہے۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۳۳)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى ﴿١٥﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَتَرْدٰى ﴿١٦﴾

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿١٧﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ

ہر شخص کو اُس کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔[21] چنانچہ کوئی ایسا شخص جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشوں کا پیرو ہے، تم کو نماز سے[22] روک نہ دے کہ تم ہلاک ہو جاؤ۔ ۱۱-۱۶

اور یہ تمھارے ہاتھ[23] میں کیا ہے،[24] اے موسیٰ! اُس نے کہا: یہ میری لاٹھی ہے، میں اِس پر ٹیک لگاتا

۲۱؎ یہ قیامت کا مقصد بیان کر دیا ہے کہ وہ اِس لیے اٹل اور شدنی ہے کہ لوگوں کو اُن کے اعمال کا بدلہ دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ کارخانۂ ہستی کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، اِس سے زیادہ اِس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ پھر اِس میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے عمل ہی کا بدلہ پائے اور کسی کی سفارش و شفاعت یا رشتہ و پیوند اُس کے بارے میں خدا کے فیصلے پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ آیت میں 'بِمَا تَسْعٰى' کا لفظ اِسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

۲۲؎ اصل میں 'هَا' کی ضمیر ہے۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ اِس کا مرجع بھی قیامت ہی کو ہونا چاہیے، مگر زبان کا ذوق رکھنے والا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اِس کے لیے 'يَصُدَّنَّ' کا فعل کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ چنانچہ یہ اِس بات کا واضح قرینہ ہے کہ اِس کا مرجع نماز ہے جس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔ پھر روکنے والے کی جو صفات بیان ہوئی ہیں، وہ بھی ترک نماز کے ساتھ لازم و ملزوم کا رشتہ رکھتی ہیں۔ اِس طرح کے قرائن موجود ہوں تو ضمیر کا انتشار کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ اِس سے، اگر غور کیجیے تو کلام میں ایجاز کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہود کی بدقسمتی ہے کہ اُنھوں نے نماز بھی ضائع کر دی اور آخرت کو بھی بھلا بیٹھے، دراں حالیکہ اُن کے پیغمبر کو سب سے پہلے اِنھی دو چیزوں کی تعلیم دی گئی تھی۔

۲۳؎ اصل میں لفظ 'يَمِيْن' آیا ہے۔ یہ دائیں بائیں کے مفہوم سے مجرد ہو کر محض ہاتھ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ اِسی معنی میں ہے۔

۲۴؎ یہ سوال طلب علم کے لیے نہیں، بلکہ التفات و نوازش کے اظہار کے لیے ہے تاکہ حضرت موسیٰ اُس لاٹھی کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جائیں جس سے حیرت انگیز معجزے ظہور میں آنے والے تھے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ وَلِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی ﴿۱۸﴾ قَالَ اَلْقِهَا یٰمُوْسٰی ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰهَا
فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی ﴿۲۰﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی ﴿۲۱﴾
وَاضْمُمْ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اٰیَةً اُخْرٰی ﴿۲۲﴾ لِنُرِیَكَ
مِنْ اٰیٰتِنَا الْكُبْرٰی ﴿۲۳﴾

ہوں اور اِس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں[۲۵] اور اِس میں میرے کچھ دوسرے کام بھی ہیں[۲۶]۔ فرمایا: اِس کو (زمین پر) ڈال دو، اے موسیٰ! اِس پر موسیٰ نے لاٹھی کو (زمین پر) ڈال دیا تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔ فرمایا: اِس کو اٹھا لو اور ڈرو نہیں، ابھی ہم اِس کو ویسا ہی کر دیں گے، جیسی یہ پہلے تھی۔ اور اپنے ہاتھ کو (ذرا) تم اپنے بازو کی طرف سکیڑو، وہ بغیر کسی بیماری کے[۲۷] سفید ہو کر نکلے گا، ایک دوسری نشانی کے طور پر[۲۸]۔ یہ اِس لیے کہ (اِن کے ذریعے سے) ہم اپنی کچھ بڑی بڑی نشانیاں تمھیں دکھائیں[۲۹]۔ ۱۷-۲۳

۲۵؎ پتے بالعموم درختوں سے اور بکریوں کے اوپر جھاڑے جاتے ہیں۔ آیت میں 'عَلٰی غَنَمِیْ' کے الفاظ اِسی رعایت سے آئے ہیں۔

۲۶؎ موسیٰ علیہ السلام جواب میں صرف اتنی بات بھی کہہ سکتے تھے کہ حضور، یہ لاٹھی ہے۔ مگر اُنھوں نے سوال کے انداز سے بھانپ لیا کہ التفات خاص کا موقع ہے، چنانچہ لمبا جواب دیا۔ گویا وہی صورت پیدا ہو گئی کہ —— 'لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم'۔ استاذ امام کے الفاظ میں، مخاطب کرنے والا محبوب و مطلوب ہو تو گفتگو کو طویل کرنے کی خواہش ایک امر فطری ہے۔

۲۷؎ یہ اضافہ صاف واضح کر رہا ہے کہ یہاں بائیبل کی تردید مقصود ہے جس میں ہاتھ کی سفیدی کو برص بتایا گیا ہے۔

۲۸؎ یعنی اُسی طرح ایک نشانی کے طور پر جیسے عصا سانپ بن جائے گا۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ کسی بیماری کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ہاتھ کی سفیدی مستقل نہیں تھی، بلکہ اُسی وقت ظاہر ہوتی تھی، جب اُسے ایک نشانی کے طور پر دکھانے کے لیے بغل میں ڈال کر نکالا جاتا تھا۔

۲۹؎ اشارہ ہے اُن بڑی بڑی نشانیوں کی طرف جو بعد میں اِنھی دو نشانیوں کے اندر سے ظاہر ہوتی رہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ ﴿۲۵﴾ وَ یَسِّرۡ لِیۡۤ

(اچھا، اب) فرعون کے پاس جاؤ،[30] وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔[31] موسیٰ نے عرض کیا:[32] پروردگار، تو

انبیا علیہم السلام کو معجزات بالعموم اُن کی دعوت کے مرحلۂ اتمام حجت میں دیے جاتے ہیں، لیکن موسیٰ علیہ السلام کو یہ ابتدا ہی میں اِس لیے دے دیے گئے کہ وہ ایک منتقم و جبار اور سرکش بادشاہ کی طرف رسول بنا کر بھیجے جا رہے تھے جو آسانی کے ساتھ اُن کی کوئی بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اللہ تعالیٰ نے شروع ہی میں اُن کو دو ایسے معجزوں سے مسلح کر دیا جن کی مدد سے وہ اپنے دشمن کی ہر تعدی سے محفوظ رہے اور اُنھوں نے فرعون کے سامنے جاتے ہی، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہو گا، اپنے اِن معجزات کا اظہار بھی کر دیا تاکہ وہ خبردار رہے کہ اگر اُس نے کوئی غلط اقدام کیا تو وہ بھی خالی ہاتھ نہیں آئے ہیں، بلکہ اُن کے ہاتھ میں بھی وہ عصا ہے جو ہر کبر و غرور کا سر پاش پاش کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔'' (تدبرقرآن ۵/ ۳۶)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۳۰؎ مصر کے اصل باشندے قبطی تھے۔ اُن کی طرف بھیجنے کے بجاے یہ فرعون کی طرف جانے کی ہدایت اِس لیے کی گئی ہے کہ اُس وقت کے نظام میں بادشاہ کے دل و دماغ کو مفتوح کیے بغیر اُس کی رعایا تک دعوت پہنچانا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔

۳۱؎ یہاں اجمال ہے، لیکن دوسرے مقامات میں قرآن نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ فرعون سورج دیوتا کے مظہر کی حیثیت سے خود رب اعلیٰ بنا ہوا تھا اور خدا کے بندوں پر اُس کے مظالم اِس حد کو پہنچے ہوئے تھے کہ بنی اسرائیل کے بیٹے قتل کر دیے جاتے تھے اور صرف لڑکیاں لونڈیوں کی خدمت انجام دینے کے لیے زندہ رکھی جاتی تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام اِن سب چیزوں سے واقف تھے، بلکہ خود ظلم و عدوان ہی کے اندیشے سے جلاوطنی کی زندگی گزار کر آ رہے تھے، اِس لیے قرآن نے صرف اشارے پر اکتفا کی ہے۔

۳۲؎ یہ اِس موقع پر موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے جس کی کوئی نظیر انبیا علیہم السلام کی تاریخ سے بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اِس دعا کے لفظ لفظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اِس بوجھ کو کتنا بھاری محسوس کیا ہے اور کس دل سوزی کے ساتھ اِس بارگراں کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ سے مدد و رہنمائی کے لیے التجا کی ہے۔ دنیا پرست لیڈروں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ لیڈری ہی کی ہوس میں جیتے اور اُسی کے عشق میں مرتے ہیں، لیکن حضرات انبیا علیہم السلام کا سینہ اِس ہوس سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ اُن کو اللہ تعالیٰ جب امامت کے منصب پر

اَمۡرِیۡ ﴿۲۶﴾ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ ﴿۲۷﴾ یَفۡقَہُوۡا قَوۡلِیۡ ﴿۲۸﴾ وَاجۡعَلۡ لِّیۡ وَزِیۡرًا
مِّنۡ اَہۡلِیۡ ﴿۲۹﴾ ہٰرُوۡنَ اَخِی ﴿۳۰﴾ اشۡدُدۡ بِہٖۤ اَزۡرِیۡ ﴿۳۱﴾ وَاَشۡرِکۡہُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ﴿۳۲﴾

میرا سینہ کھول دے[۳۳] اور میرے کام کو میرے لیے آسان بنا دے[۳۴] اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے کہ لوگ میری بات کو سمجھیں[۳۵]۔ اور میرے خاندان سے تو میرے لیے ایک وزیر مقرر کر دے۔

مامور فرماتا ہے تو وہ اُس کی ذمہ داریوں کے تصور سے کانپ اٹھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ جب اُس نے اُن پر یہ بوجھ ڈالا ہے تو وہی اُس کے اٹھانے کے لیے ہمت و قوت بخشے اور ہر قدم پر دست گیری و رہنمائی فرمائے۔''

(تدبر قرآن ۵/۳۷)

۳۳؎ موسیٰ علیہ السلام پر جس عظیم منصب کی ذمہ داری ڈالی جا رہی تھی، اُس کو سنبھالنے کے لیے جیسا کچھ اضطراب و تردد کسی فرض شناس آدمی کو ہو سکتا ہے، یہ اُس کو دور کرنے کی درخواست ہے اور اِس لیے کی گئی ہے کہ سینے کی یہ خلش اللہ تعالیٰ کے فضل و عنایت ہی سے دور ہوتی ہے۔

۳۴؎ پہلی درخواست دل و دماغ کے اندر کی خلش دور کرنے کے لیے تھی۔ یہ اب حالات کی مساعدت، راہ کی ہمواری اور پیش نظر مقصد کے حصول میں کامیابی کی درخواست ہے۔

۳۵؎ اُس زمانے میں دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کا موثر ترین ذریعہ خطابت تھی۔ دوسری جگہ وضاحت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کوئی زبان آور خطیب نہیں تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے درخواست کی کہ جس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اُنھیں بھیجا جا رہا ہے، اُس کے لیے اظہار و بیان کی قوت بھی عطا فرمائی جائے تاکہ اپنی دعوت کو وہ اِس طرح پیش کر سکیں کہ مخاطبین اُن کی بات کو سمجھیں اور وہ اُن کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو۔ اُنھوں نے یہ درخواست، اگر غور کیجیے تو غایت درجہ تواضع کے اسلوب میں پیش کی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...حضرت موسیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ مجھے دلوں کو تسخیر کرنے والا ایک جادو بیان خطیب بنا دے، بلکہ نہایت خاکسارانہ انداز میں فرمایا کہ میری زبان کو وہ روانی عطا فرما کہ لوگ میری بات سمجھیں۔ یہ دعا کرنے کے لیے لکنت کا مریض ہونے کی ضرورت نہیں ہے، (جیسا کہ لوگوں نے بالعموم سمجھا ہے)، بلکہ ایک قادر الکلام بھی یہ دعا کرتا ہے اور اُسے کرنی چاہیے۔ بسا اوقات معانی و حقائق کا جوش اِس طرح سینے میں امنڈتا ہے کہ ایک قادر الکلام آدمی بھی اپنی زبان اور اپنے قلم کو اُس کی تعبیر سے قاصر محسوس کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو عام لیڈروں کی طرح صرف نعرہ نہیں لگانا تھا، بلکہ دین کے حقائق و اسرار کی تفہیم کرنی تھی اور وہ بھی ایسے لوگوں کے سامنے جو نہ صرف اُن کی تکذیب پر

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

كَيۡ نُسَبِّحَكَ كَثِيۡرًا ﴿۳۳﴾ وَّنَذۡكُرَكَ كَثِيۡرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنۡتَ بِنَا بَصِيۡرًا ﴿۳۵﴾
قَالَ قَدۡ اُوۡتِيۡتَ سُؤۡلَكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۳۶﴾

ہارون کو، جو میرا بھائی ہے[۳۶]۔ اُس کے ذریعے سے تو میری کمر کو مضبوط کر اور اُس کو میری ذمہ داری میں شریک بنا دے[۳۷] کہ ہم زیادہ سے زیادہ تیری تسبیح و تقدیس کریں اور زیادہ سے زیادہ تیرا چرچا پھیلائیں[۳۸]۔ بے شک، تو برابر ہمارے حال پر نگران رہا ہے[۳۹]۔ فرمایا: تمھاری درخواست منظور ہوئی، اے موسیٰ![۴۰] ۲۴-۳۶

ادھار کھائے بیٹھے تھے، بلکہ اُن کی جان کے دشمن تھے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ حضرت موسیٰ کو صرف چھدا اتارنے کی خواہش نہیں تھی، بلکہ وہ اپنے مخالفوں کے دل میں اتر جانے کا ارمان رکھتے تھے۔ مخالفوں سے تو یہ امید نہ تھی کہ اُن کے دل اور ہو جائیں گے، اِس لیے اُنھوں نے اپنے رب سے زبان ہی اور مانگی تا کہ اُن کو اپنی بات سمجھا سکیں۔''
(تدبر قرآن ۵/ ۴۰)

۳۶؎ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے کہ یہ درخواست بھی اصلاً اُسی قوت کی تلافی کے لیے کی گئی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ یہودی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون علیہ السلام اپنی قوم میں فصاحت بیان کے لیے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی کہ جب میرا بڑا بھائی اُن تمام صفات سے متصف ہے جو پیش نظر ذمہ داری کو ادا کرنے میں معاون ہو سکتی ہیں تو اُسی کو میرا وزیر بنا دیا جائے۔ اِس سے واضح ہے کہ اپنے بھائی کو اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی وہ پوری طرح اِس منصب کا اہل سمجھتے تھے۔

۳۷؎ یعنی میں صرف ایک ساتھی نہیں چاہتا، بلکہ اپنے ساتھ ایک شریک نبوت چاہتا ہوں تا کہ اُسے بھی میری طرح براہ راست آپ کی رہنمائی اور آپ کی طرف سے عصمت حاصل ہو اور اِس فریضۂ نبوت کو وہ بھی اپنے آپ کو مسئول اور ذمہ دار سمجھ کر ادا کرے۔ یہ درخواست غیر معمولی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کسی نبی کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ ایک دوسرا نبی اُس کا وزیر بنایا گیا ہو۔

۳۸؎ مدعا یہ ہے کہ اپنے علم و عمل اور انذار و تبلیغ میں صبح و شام ہر جگہ، خلوت ہو یا جلوت اِسی ذکر و تسبیح میں لگے رہیں، اِس لیے کہ یہی ایمان کا اظہار اور یہی فریضۂ نبوت کی ادائی ہے۔ آیت میں اِس کے لیے دو لفظ، ایک تسبیح اور دوسرا ذکر استعمال ہوئے ہیں۔ استاذ امام نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿٣٧﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿٣٨﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ

اور (یاد کرو)، ہم تمھارے اوپر ایک مرتبہ اور بھی احسان کر چکے ہیں، جب ہم نے تمھاری ماں کو وہ بات الہام کی تھی[41] جو (اِس وقت تمھیں) وحی کی جا رہی ہے[42] کہ اِس بچے کو صندوق میں

"...تسبیح میں تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور ذکر میں اثبات کا اور یہ نفی و اثبات، دونوں خدا کے ساتھ صحیح تعلق کو استوار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ جو چیزیں خدا کی شان، اُس کی صفات اور اُس کی مرضیات و احکام کے منافی ہیں، اُن کی نفی کی جائے اور جو چیزیں اُس کی شان، اُس کی صفات اور اُس کے احکام کے موافق ہیں، اُن کا اثبات و اظہار کیا جائے۔ اِن دونوں چیزوں سے مل کر مومن کا عقیدہ اور کردار بنتا ہے۔ اور نفی اثبات پر مقدم ہے۔ جب تک آپ ما سوی اللہ سے بغاوت کا اعلان نہیں کرتے، اُس وقت تک آپ اللہ کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ 'اِلَّا اللّٰہ' سے پہلے 'لَا اِلٰہَ' کا اعلان ضروری ہے۔" (تدبرقرآن ۵/۴۱)

۳۹؎ یہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعا کے حق میں خود اپنے پروردگار ہی کے فضل و کرم کو سفارش میں پیش کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیری شفقت بن مانگے ہم دونوں کو حاصل رہی ہے اور تو برابر ہمارے حال پر نگران رہا ہے۔ پھر تیری عنایتوں سے اب کس طرح محروم ہو سکتے ہیں، جب کہ ہم تیری ہی دعوت لے کر اٹھ رہے ہیں؟

۴۰؎ سبحان اللہ، کیا شان کریمی ہے! استاذ امام لکھتے ہیں:

"...یہاں موسیٰ کے خطاب میں بھی بڑا پیار ہے اور منظوری کے الفاظ میں بھی بڑی شان جھلک رہی ہے۔ دعا کے ختم ہوتے ہی بشارت سنا دی گئی کہ تمھاری عرضی منظور! گویا بہ یک جنبش قلم، بلا کسی توقف اور بلا کسی استثنا کے سب منظور! ظاہر ہے کہ اِس منظوری میں اُن کی وہ دعا بھی شامل ہے جو اُنھوں نے اظہار و بیان کی قوت بخشے جانے کے لیے کی۔ وہ بھی اُن کو عطا ہوئی اور حضرت ہارون اُن کے وزیر بھی بنا دیے گئے۔" (تدبرقرآن ۵/۴۲)

۴۱؎ اِس الہام کی نوعیت، ظاہر ہے کہ یہی رہی ہو گی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بات اُن کے دل میں ڈال دی اور اُنھیں اطمینان بھی ہو گیا کہ یہ خدا کی ڈالی ہوئی بات ہے، ورنہ ایک ماں کے لیے اِس طرح کا اقدام آسان نہیں تھا۔ اِس کے بعد بھی، نہیں کہا جا سکتا کہ اُنھوں نے کس دل و جگر سے اور کس طرح کلیجے پر پتھر رکھ کر اپنی اِس متاع عزیز کو دریا کی موجوں کے سپرد کیا ہو گا۔

۴۲؎ موسیٰ علیہ السلام کو یہ بات اُن کی والدہ ماجدہ نے ضرور بتائی ہو گی، لیکن اِس کے اندر دست غیب کی جو

وَعَدُوٌّ لَّهٗ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾ اِذْ تَمْشِيْٓ
اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا

رکھو، پھر صندوق کو دریا میں ڈال دو۔[43] پھر دریا اُس کو کنارے پر ڈال دے[44] کہ اُس کو وہ شخص اٹھا لے جو میرا بھی دشمن ہے اور اِس بچے کا بھی دشمن ہے۔[45] اور میں نے تم پر اپنی طرف سے محبت کا ایک پرتو ڈال دیا تھا تاکہ وہ بھی شفقت کے لیے مجبور ہو جائے[46] اور تاکہ تم میری نگرانی میں پالے جاؤ۔[47] اُس وقت جب تمھاری بہن (اجنبی بن کر) بار بار جاتی، پھر اُن سے کہتی تھی[48] کہ (تم کہو تو) میں

کارفرمائیاں تھیں، اُن کی طرف اب اُنھیں وحی کے ذریعے سے توجہ دلائی جارہی ہے۔

۴۳؎ یہ ہدایت اِس لیے کی گئی کہ فرعون نے اُس زمانے میں اسرائیلی بچوں کے قتل کا حکم دے رکھا تھا۔ سورۂ قصص (۲۸) کی آیت ۴ میں قرآن نے اِس کی صراحت فرمائی ہے۔ یہاں اِس واقعے کی یاددہانی سے مقصود یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کا اضطراب رفع کیا جائے کہ بغیر کسی تردد کے وہ فرعون کے پاس جائیں اور اطمینان رکھیں کہ جس خدا نے اُس وقت اُنھیں بچا لیا تھا، وہی اب بھی حفاظت فرمائے گا۔ وہ اُن کے ساتھ ہے، اِس لیے اُنھیں اِس مہم سے ہرگز کوئی اندیشہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

۴۴؎ یعنی ایک طرف تمھاری ماں کے دل میں وہ بات ڈالی گئی اور دوسری طرف دریا کو بھی یہ حکم دے دیا گیا۔

۴۵؎ یہ حوالہ اِس لیے دیا گیا ہے کہ اب خدا اِسی دشمن سے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کرانے والا تھا۔ چنانچہ قرآن اور بائیبل، دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی ہوا اور فرعون اور اُس کی بیوی نے نیل کے کنارے سیر کرتے ہوئے بچے کو صندوق میں دیکھا اور اِس خیال کے باوجود کہ یہ غالباً کوئی اسرائیلی بچہ ہے جسے قتل کے اندیشے سے تن بہ تقدیر دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا گیا ہے، اُن کے دل میں ایسا رحم پیدا ہوا کہ اُنھوں نے اُسے اٹھا لیا۔

۴۶؎ یہ جملہ معللہ کا معطوف علیہ ہے جو اصل میں محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بچہ یوں بھی موہنا ہی ہوتا ہے، لیکن ہم نے مزید عنایت یہ کی کہ تمھاری حفاظت کے لیے تم پر اپنی طرف سے محبت کا ایک پرتو بھی ڈال دیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...کون اندازہ کر سکتا ہے اُس بچے کے موہنے پن کا جس پر محبت الٰہی کا پرتو ہو! ایک ایسا موہنا بچہ جب وہ سرکنڈوں کی ایک ٹوکری میں، دریا کی موجوں کا پھینکا ہوا، یکہ وتنہا، معصومیت و دل آویزی کی مورت بنا ہوا پڑا ہو تو

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَلَا تَحۡزَنَ ﴿۴۰﴾

تمھیں اُن لوگوں کا پتا دوں جو اِس بچے کی پرورش کریں؟ اِس طرح ہم نے تم کو تمھاری ماں کی طرف لوٹا دیا کہ اُس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور اُس کو غم نہ رہے۔[۴۹] ۳۷-۴۰

آخر کس کا دل اُس کو دیکھ کر تڑپ نہیں جائے گا! فرعون آخر فرعون ہی تھا، کوئی پتھر تو نہیں تھا۔'' (تدبر قرآن ۵/ ۴۴)

۴۷؎ یعنی محبت کا جو پرتو تم پر ڈالا گیا، وہ تمھارا محافظ بن جائے اور فرعون جیسا دشمن بھی شفقت کے لیے مجبور ہو جائے۔ آیت میں 'لِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ' کے الفاظ سے اِسی حفاظت اور نگرانی سے تعبیر فرمایا ہے۔

۴۸؎ اصل میں مضارع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اور مضارع سے پہلے ایک فعل ناقص عربیت کے قاعدے سے محذوف ہے۔ ترجمے میں بار بار جانے کی صراحت اِسی بنا پر کی گئی ہے۔

۴۹؎ یہاں اجمال ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے دریا میں ڈالے جانے کے بعد اُن کی ماں کی طرف لوٹائے جانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہ تدبیر سورۂ قصص (۲۸) کی آیات ۷-۱۳ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...جب فرعون کی بیوی نے بچے کو دیکھا تو اُنھوں نے فرعون سے کہا کہ بڑا موہنا بچہ ہے۔ اِس کو قتل نہ ہونے دو۔ یہ میری اور تمھاری، دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ یہ ہمارے کام آئے گا یا ہم اِس کو لے پالک بنا لیں گے۔ اِدھر والدۂ حضرت موسیٰ کا یہ حال تھا کہ اُنھوں نے بچے کو ایماے خداوندی سے دریا میں ڈال تو دیا، لیکن غم سے کلیجا پھٹا جا رہا تھا۔ اُنھوں نے حضرت موسیٰ کی بہن سے کہا کہ وہ دیکھتی رہیں کہ صندوق کدھر بہ کے جاتا ہے۔ وہ لوگوں کی نظر بچا کر اُس کو دیکھتی رہیں۔ بالآخر اُن کو معلوم ہو گیا کہ صندوق فرعون کے محل کے پاس پہنچا اور وہاں دریا نے اُس کو کنارے پر ڈال دیا اور فرعون اور اُس کی بیوی نے بچے کو اٹھا لیا۔ حضرت موسیٰ کی بہن فرعون کے محل میں پہنچیں۔ وہاں اُنھوں نے دیکھا کہ بچے کو کسی دایہ کا دودھ پلانے کی کوشش کی جا رہی ہے، لیکن بچہ مچلا ہوا ہے، وہ کسی کی چھاتی منہ ہی سے نہیں لگاتا۔ حضرت موسیٰ کی بہن نے فرعون کی بیوی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر آپ لوگ کہیں تو میں ایک ایسے گھر والوں کا پتا دے سکتی ہوں جو اِس بچے کی نہایت اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے اور بچے کو مانوس کر لیں گے۔ چونکہ حضرت موسیٰ کے دودھ نہ پینے کے سبب سے فرعون اور اُس کے گھر والوں کو نہایت پریشانی تھی، اِس وجہ سے یہ تجویز مان لی گئی اور اِس طرح حضرت موسیٰ پھر اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ گئے۔''

(تدبر قرآن ۵/ ۴۶)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿۴۱﴾

اور (یاد کرو کہ) تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔[۵۰] پھر ہم نے تم کو اِس غم سے بھی نجات دی[۵۱] اور تم کو خوب خوب جانچا۔[۵۲] پھر (ہماری عنایت سے) تم کئی سال مدین کے لوگوں میں رہے۔[۵۳] پھر ٹھیک ایک اندازہ کیے ہوئے وقت پر (یہاں) پہنچ گئے ہو، اے موسیٰ![۵۴] اور (اب اِن سب مراحل سے گزار کر) میں نے تمھیں اپنے (اِس کارِ خاص کے) لیے تیار کر لیا ہے۔[۵۵] ۴۰-۴۱

۵۰؎ سورۂ قصص (۲۸) میں ہے کہ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے، جب حضرت موسیٰ جوانی کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور گاہے گاہے اپنی قوم کے حالات کو دیکھنے کے لیے فرعون کے محلات سے نکل کر شہر میں جاتے رہتے تھے۔ ایک دن اِسی طرح جب وہ شہر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک اسرائیلی اور ایک قبطی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ سے فریاد کی۔ وہ اُس کی مدد کے لیے آگے بڑھے تو قبطی اُن سے الجھ پڑا۔ اِس پر اُنھوں نے اُس کو ایک گھونسا مارا جو کہیں ایسا بے ڈھب پڑا کہ قبطی وہیں ڈھیر ہو کے رہ گیا۔

۵۱؎ یہ قتل اگرچہ بلا قصد ہوا تھا، مگر حضرت موسیٰ ایک خدا ترس آدمی تھے، لہٰذا سخت غم زدہ ہوئے کہ یہ کیا حادثہ ہو گیا ہے جس پر ہو سکتا ہے کہ مجھے خدا کے ہاں مسئول ٹھیرایا جائے۔ پھر اُنھیں یہ تردد بھی تھا کہ ممکن ہے جس کو مظلوم سمجھ کر اُس کی حمایت میں یہ فعل اُن سے صادر ہوا، زیادتی اُسی کی رہی ہو۔ اِسی طرح یہ چیز بھی باعث غم ہوئی ہو گی کہ فرعونیوں سے انصاف کی توقع نہیں ہے، وہ لازماً اِسے قتل عمد ٹھیرائیں گے۔ چنانچہ سورۂ قصص (۲۸) ہی میں ہے کہ اُنھوں نے بہت استغفار کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی غلطی معاف کر دی اور وہ غم کی اِس حالت سے نکل آئے۔

۵۲؎ یعنی ہر طرح کی آزمایشوں سے گزارا تاکہ جس عظیم ذمہ داری کے لیے اُن کو منتخب کرنا مقصود ہے، وہ اُس کے پوری طرح اہل بن جائیں۔

۵۳؎ یعنی تم کو وہاں پناہ مل گئی، تمھارا گھر آباد ہوا اور تم فرعونیوں کی نگاہ میں ایک مجرم قرار پا جانے کے باوجود اُن کے تعاقب سے بچے رہے۔

۵۴؎ یعنی ٹھیک ہماری اسکیم اور ہمارے مقرر کیے ہوئے پروگرام کے مطابق پہنچ گئے ہو۔

۵۵؎ مطلب یہ ہے کہ اتنی بھٹیوں سے تپا کر اور اتنے امتحانوں میں ڈال کر تیار کر لیا ہے تو اب یہ ذمہ داری تم کو اٹھانی ہی ہے۔ اِن سب مراحل سے تم اِسی کے لیے گزارے گئے ہو۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

’’...بہت سے لوگ جب روزے میں کھانے پینے اور اِس طرح کی دوسری دل چسپیوں کو چھوڑتے ہیں تو اپنی اِس محرومی کا مداوا اُن دل چسپیوں میں ڈھونڈنے لگتے ہیں جن سے اُن کے خیال میں روزے کو کچھ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بہل جاتا ہے۔ وہ روزہ رکھ کر تاش کھیلیں گے، ناول اور افسانے پڑھیں گے، نغمے اور غزلیں سنیں گے، فلمیں دیکھیں گے، دوستوں میں بیٹھ کر گپ ہانکیں گے اور اگر یہ سب نہ کریں گے تو کسی کی غیبت اور ہجو ہی میں لپٹ جائیں گے۔ روزے میں پیٹ خالی ہو تو آدمی کو اپنے بھائیوں کا گوشت کھانے میں ویسے بھی بڑی لذت ملتی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات صبح اِس مشغلے میں پڑتے ہیں اور پھر موذن کی اذان کے ساتھ ہی اِس سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔‘‘ (میزان، جاوید احمد غامدی ۳۶۶)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

’’...بھوک اور پیاس کی حالت میں چونکہ طبیعت میں کچھ تیزی پیدا ہو جاتی ہے، اِس وجہ سے بعض لوگ روزے کو اُس کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے بجاے، اُسے بھڑکانے کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں اور اپنے نیچے کام کرنے والوں پر ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے، جو منہ میں آیا، کہہ گزرتے، بلکہ بات بڑھ جائے تو گالیوں کا جھاڑ باندھ دیتے ہیں، اور بعض حالتوں میں اپنے زیردستوں کو مارنے پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اِس کے بعد وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ روزے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔‘‘ (میزان، جاوید احمد غامدی ۳۶۵)

مولانا امین احسن اصلاحی

روزہ اور برکات روزہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شہوات اور خواہشات نفس کے غلبہ سے انسان کے اندر خدا سے جو غفلت اور اس کے حدود سے جو بے پروائی پیدا ہوتی ہے، اس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزے کی عبادت مقرر کی ہے۔ اس عبادت کا نشان تمام قدیم مذاہب میں بھی ملتا ہے، بالخصوص تزکیۂ نفس کے جتنے طریقے بھی صحیح یا غلط دنیا میں اب تک اختیار کیے گئے ہیں، ان سب میں اس عبادت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مذاہب کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ پچھلے ادیان میں اس عبادت کے آداب وشرائط، اسلام کی نسبت سے زیادہ سخت تھے۔ اسلام دین فطرت ہے، اس وجہ سے اس نے اس کی ان پابندیوں کو نسبتاً نرم کر دیا ہے جو انسان کی عام طاقت کے تحمل سے زیادہ تھیں، جن کو صرف خاص خاص لوگ ہی برداشت کر سکتے تھے۔

یہ عبادت نفس پر شاق ہونے کے اعتبار سے تمام عبادات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس انسانی کی تربیت واصلاح میں اس کا عمل بڑا مشکل ہے۔ یہ انسان کے نہایت سرکش اور منہ زور رجحانات پر کمند ڈالتی اور ان کو رام کرتی ہے، اس وجہ سے یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان کے مزاج میں سختی اور درشتی ہو۔

نفس انسانی کے جو پہلو سب سے زیادہ زوردار ہیں، ان میں شہوات، خواہشات اور جذبات سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان کی فطرت میں اشتعال، ہیجان اور جوش ہے، اس وجہ سے ارادہ کو ان پر قابو پانے کے لیے بڑی ریاضت

کرنی پڑتی ہے۔ یہ ریاضت اتنی سخت اور ہمت شکن ہے کہ قدیم مذہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تزکیۂ نفس کے بہت سے طالبین سرے سے اس چیز ہی سے مایوس ہو گئے کہ ان کو قابو میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان کو قابو میں لانے اور ان کی تربیت کرنے کے بجاے ان کے یک قلم ختم کر دینے کی تدبیریں سوچیں اور اختیار کیں، لیکن اسلام ایک دین فطرت ہے اور یہ چیزیں بھی انسانی فطرت کے لازمی اجزا میں سے ہیں، جن کے بغیر انسان کے شخصی اور نوعی تقاضوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے اس نے ان کو ختم کر دینے کی اجازت نہیں دی ہے، بلکہ ان کو قابو میں کر کے ان کو صحیح راہ پر لگانے کا حکم دیا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کو قابو میں کرنا ان کو ختم کر دینے کے مقابل میں کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک منہ زور گھوڑے کو ختم کر دینا ہو تو اس کے لیے زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ بندوق کی ایک گولی اس کو ٹھنڈا کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے، لیکن اگر اس کو رام کر کے سواری کے کام میں لانا ہے تو یہ مقصد ایک ماہر شہ سوار بڑی ریاضتوں، بڑی مشقوں اور بہت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد ہی حاصل کر سکتا ہے۔

روزے کی عبادت اسلام نے اس لیے مقرر فرمائی ہے کہ ایک طرف نفس انسانی کے یہ سرکش رجحانات ضعیف ہو کر اعتدال پر آئیں اور دوسری طرف انسان کی قوت ارادی ان کو دبانے اور ان کو حدود الٰہی کا پابند بنانے کے لیے طاقت ور ہو جائے۔ اپنے اس دو طرفہ عمل کے سبب سے تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، اس عبادت کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی برکات کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ اس کی چند برکات کا ذکر کریں گے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

روزے کی برکات

روح ملکوتی کی آزادی

روزے کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اس سے انسان کی روح ملکوتی کو نفسانی خواہشات کے دباؤ سے بہت بڑی حد تک آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہماری روح ملکوتی کا حقیقی میلان ملاء اعلیٰ کی طرف ہے۔ وہ فطری طور پر خدا کے تقرب، ملائکہ سے تشبہ اور سفلیات سے تجرد کی طالب ہے اور مادی زندگی کے تقاضوں میں گرفتار رہنے کے بجاے اعلیٰ عقلی و اخلاقی مقاصد کے لیے پرواز کرنا چاہتی ہے، روح کے ان تقاضوں اور نفس کے ان مطالبات میں،

جوخواہشات وشہوات سے پیدا ہوتے ہیں، ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔ ان دونوں میں اکثر تصادم رہتا ہے اور اس تصادم میں اکثر جیت خواہشات وشہوات ہی کو ہوتی ہے۔

یہ صورت حال ظاہر ہے کہ روح کے فطری میلانات کے بالکل خلاف ہے۔ اگر یہی حالت عرصہ تک باقی رہ جائے اور روح کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کا کوئی موقع نہ ملے تو پھر نہ صرف یہ کہ اس کی قوت پرواز ختم ہو جاتی ہے، بلکہ آہستہ آہستہ وہ خود بھی ختم ہو جاتی ہے۔

روزہ اس صورت حال میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ یہ ان چیزوں پر بہت سی پابندیاں عائد کر دیتا ہے جو شہوات وخواہشات کو تقویت پہنچانے والی ہیں۔ اس سے آدمی کا کھانا پینا اور سونا سب کم ہو جاتا ہے۔ دوسری لذتوں اور دل چسپیوں پر بھی بعض پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔ ان چیزوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ نفس کے شہوانی میلانات کی جولانیاں بہت کم ہو جاتی ہیں اور روح ملکوتی کو اپنی پسند کے میدانوں میں جولانی کے لیے موقع مل جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

روزے کی یہی خصوصیت ہے جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ساتھ ایک خاص نسبت دی ہے اور روزہ دار کو خاص اپنے ہاتھ سے اس کے روزے کی جزا دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ یوں تو اسلام نے جتنی عبادتیں بھی مقرر فرمائی ہیں، سب اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں، لیکن روزے میں دنیا اور لذات دنیا کو ترک کر کے بندہ خدا سے قرب اور اس کے ملائکہ سے مناسبت اور تشبہ حاصل کرنے کی جو کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں مشقت اٹھاتا ہے، وہ روزے کے سوا کسی دوسری عبادت میں اس قدر نمایاں نہیں ہے۔ فقر، درویشی، زہد، تجرد، ترک دنیا اور تبتل الی اللہ کی جو شان اس عبادت میں ہے، وہ اس کا خاص حصہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں ہے کہ رہبانیت جس حد تک اسلام میں جائز رکھی گئی ہے اور جس درجہ تک اللہ تعالیٰ نے تربیت نفس کے لیے اس کو پسند فرمایا ہے، اسلام میں یہی عبادت اس کا مظہر ہے۔ اگر ایک بندہ روزے کی ساری مشقتیں اور پابندیاں فی الحقیقت اسی لیے جھیلتا ہے کہ اس کی روح اس عالم ناسوت کی دلدل سے آزاد ہو کر عالم لاہوت کی طرف پرواز کر سکے اور اسے خدا کا قرب حاصل ہو سکے تو بلاشبہ اس کی یہ کوشش اسی چیز کی مستحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ساتھ خاص نسبت دے اور اس کی جزا خاص اپنے ہاتھوں سے دے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو جس میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم:	''جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا
''قال اللّٰه: كل عمل ابن آدم له إلا الصيام	کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے

فإنّه لي وأنا أجزي به. والصيام جُنة. و إذا كان يوم صوم أحدكم فلا يرفث ولا يصخب فإن سابّه أحد أوقاتله فليقل: إنّي امرؤ صائم. والذي نفس محمد بيده، لخلوف فم الصائم أطيب عند اللّٰه من ريح المِسك. للصائم فرحتان يفرحهما: إذا أفطر فرح وإذا لقي ربّه فرح بصومه". (بخاری، رقم ۱۹۰۴)

ہے، مگر روزہ، یہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ ایک سپر ہے۔ جب کسی کا روزہ ہو تو اسے چاہیے کہ نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ شور و شغب کرے۔ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ کرے یا لڑے جھگڑے تو وہ اس سے کہے کہ بھائی، میں روزے سے ہوں۔ اس خدا کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے، روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوش بو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: ایک اس کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ روزہ کھولتا ہے اور دوسری اس وقت حاصل ہو گی جب وہ اپنے رب سے ملے گا۔''

مزید روایات میں اسی سلسلہ کی کچھ اور باتیں ہیں جن سے حدیث کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے ہم ان کو بھی یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

يترك طعامه و شرابه و شهوته من أجلي. الصيام لي وأنا أجزي به. والحسنة بعشر أمثالها. (بخاری، رقم ۱۷۹۵)

''(اللہ تعالیٰ نے فرمایا:) بندہ اپنا کھانا اور پینا اور اپنی شہوت میرے لیے چھوڑتا ہے۔ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ نیکیوں کا بدلہ دس گنا ہے۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: "كلّ عمل ابن آدم يُضاعف الحسنة عشر أمثالها إلىٰ سبع مأة ضعف، قال اللّٰه عزّوجلّ: إلّا الصوم فإنه لي وأنا أجزي به يدع شهوته وطعامه من أجلي، للصائم فرحتان: فرحة عند فطره و فرحة عند لقاء ربّه. ولَخلوفُ فيه أطيب عند اللّٰه من ريح المِسكِ". (مسلم، رقم ۱۱۵۱)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابن آدم کا ہر عمل بڑھایا جائے گا، یعنی نیکیاں دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بڑھائی جائیں گی، مگر روزے کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ بندہ اپنی خواہش اور اپنا کھانا پینا میرے لیے قربان کرتا ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی اس کو افطار کے وقت حاصل ہوتی ہے، دوسری خوشی اس کو اپنے رب کی ملاقات

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کے وقت حاصل ہو گی۔ اور اس کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ
کے نزدیک مشک کی خوش بو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔‘‘

ان دونوں روایتوں کو ملا کر غور کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کو اپنی طرف خاص نسبت کیوں دی ہے اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خاص اپنے ہاتھ سے اس کا بدلہ دینے کا مطلب کیا ہے۔

اس کو اپنے لیے خاص قرار دینے کی وجہ تو یہ ہے کہ بندہ محض اس کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے اپنی ان خواہشوں اور اپنے نفس کے ان مطالبات کو ترک کرتا ہے جن کا اس کے نفس پر سب سے زیادہ غلبہ ہوتا ہے اور جن کے اندر اس کی تمام مادی خوشیاں اور تمام مادی لذتیں سمٹی ہوئی ہیں۔ ان لذتوں سے محض اللہ کی رضا کے لیے منہ موڑ لینا اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ اس نے اسے محبوبیت کا ایک خاص درجہ دیا اور فرمایا کہ بندہ روزہ خاص میرے لیے رکھتا ہے اور میری خوشی کے لیے اپنا کھانا پینا اور اپنی لذتوں کو چھوڑتا ہے۔

خاص اپنے ہاتھ سے بدلہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ نیکیوں کے بدلہ کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بندھے ہوئے قاعدے ہیں۔ حالات و خصوصیات کے لحاظ سے ہر نیکی کا دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک بدلہ ملے گا۔ مثلاً فرض کیجیے ایک نیکی سازگار حالات کے اندر کی گئی ہے اور دوسری نیکی مشکل حالات کے اندر کی گئی ہے یا ایک نیکی پوری احتیاط اور پوری نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری نسبتاً کم اہتمام اور کم نگہداشت کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس طرح کے فرق و اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شخص کی نیکی کا جو اجر ہونا چاہیے، وہ مذکورہ بالا اصول کے مطابق خدا کے رجسٹر میں درج ہو گا اور ہر حق دار اس اجر کو حاصل کر لے گا، لیکن روزے کی جو عبادت ہے، اس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اس فارمولے کے تحت نہیں رکھا ہے، بلکہ اس کا فیصلہ کسی اور فارمولے کے مطابق ہو گا جس کا علم صرف اسی کو ہے۔ جب جزا دینے کا وقت آئے گا، تب وہی اس کو کھولے گا اور خاص اپنے ہاتھ سے ہر روزہ رکھنے والے کو صلہ دے گا۔ جس عبادت کی جزا کے لیے یہ کچھ اہتمام ہو گا، کون اندازہ کر سکتا ہے کہ آسمان و زمین سب کا مالک اس کی کیا جزا دے گا۔

سد ابواب فتنہ

اس کی دوسری برکت یہ ہے کہ آدمی کے اندر فتنہ کے جو بڑے بڑے دروازے ہیں، روزہ ان کو بہت بڑی حد تک بند کر دیتا ہے۔ آدمی کے اندر فتنے کے بڑے دروازے، جیسا کہ ایک سے زیادہ حدیثوں میں تصریح ہے، بطن اور فرج ہیں، انھی کے سبب سے آدمی نہ جانے خود کتنی ہلاکتوں میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی نہیں معلوم کتنی ہلاکتوں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں مبتلا کرتا ہے۔ یہی راستے ہیں جن سے شیطان انسان پر سب سے زیادہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان ان کی حفاظت کر سکے تو سمجھیے کہ اس نے اپنے آپ کو دوزخ کے عذاب سے بچالیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے لیے جنت کی ضمانت دی ہے جو شخص ان دونوں چیزوں کی حفاظت کی ضمانت دے سکے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو:

> ''حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ان چیزوں کے بارے میں مجھے ضمانت دے سکے جو اس کے دونوں کلّوں اور دونوں ٹانگوں کے درمیان میں ہیں، میں اس کے لیے جنت کا ضامن بنتا ہوں۔'' (بخاری، رقم ۶۱۰۹)

روزہ ان کی حفاظت کا بہتر سے بہتر انتظام کرتا ہے۔ انسان کے لیے روزے میں صرف کھانا پینا ہی حرام نہیں ہو جاتا، بلکہ لڑنا جھگڑنا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا اور غیر ضروری باتوں میں حصہ لینا بھی روزے کے مقصد کے بالکل خلاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح روزے میں صرف شہوانی تقاضوں کا پورا کرنا ہی حرام نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ تمام چیزیں بھی روزے کے منشا کے خلاف ہیں جو اس کے شہوانی میلانات کو شہ دینے والی ہوں۔ روزہ خود بھی ان میلانات کو ضعیف کرتا ہے اور روزہ دار کو بھی ہدایت ہے کہ وہ حتی الامکان اپنے آپ کو ان تمام مواقع سے دور رکھے جہاں سے اس کے ان رجحانات کو غذا بہم پہنچ جانے کا امکان ہو۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فتنہ کے دروازوں کے بند ہو جانے سے اس کے لیے ان کاموں کا کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے جو خدا کی رضا کے کام ہیں اور جن سے جنت حاصل ہوتی ہے اور ان کاموں کی راہیں بند ہو جاتی ہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف کام ہیں اور جن کے سبب سے آدمی دوزخ میں پڑے گا۔ شیطان اس کے آگے بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی ساری چوکڑی بھول جاتی ہے۔ وہ ڈھونڈتا ہے، لیکن اس کو روزہ دار پر حملہ کرنے کے لیے کوئی راہ نہیں ملتی۔ یہی حقیقت ہے جو ایک حدیث شریف میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم: "إذا دخل شهر رمضان فُتِّحَتْ أبواب السماء و غُلِّقت أبواب جهنم و سُلْسلت الشیاطین". (بخاری، رقم ۱۸۰۰)	''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب رمضان کا مہینا آتا ہے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں۔''

قوت ارادی کی تربیت

روزے کی تیسری برکت یہ ہے کہ یہ آدمی کی قوت ارادی کی بہترین طریقہ پر تربیت کرتا ہے۔ شریعت کے حدود کی پابندی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی کی قوت ارادی نہایت مضبوط ہو۔ بغیر مضبوط قوت ارادی کے یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص شہوات و جذبات اور خواہشات کے غیر معتدل ہیجانات کو دبا سکے اور جو شخص ان کے مفرط ہیجان کو دبا نہیں سکتا، اس کے لیے یہ محال ہے کہ وہ شریعت کے حدود کو قائم رکھ سکے۔ ایک ضعیف اور لچلچے ارادہ کا آدمی ہر قدم پر ٹھوکر کھا سکتا ہے۔ جب بھی کوئی چیز اس کے غصہ کو اشتعال دلانے والی سامنے آجائے گی، وہ بڑی آسانی سے اس سے مغلوب ہو جائے گا؛ جب بھی کوئی طمع پیدا کرنے والی چیز اس کو اشارہ کر دے گی، وہ اس کے پیچھے لگ جائے گا اور جہاں بھی کوئی چیز اس کو اکسانے والی نظر آجائے گی، وہیں وہ پھسل کے گر پڑے گا۔ اس طرح کی ضعیف قوت ارادی کا انسان دنیا میں عزم و ہمت کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ وہ شریعت کے حدود و قیود کی پابندی کر سکے۔ بالخصوص شریعت کا وہ حصہ جو انسان کو برائیوں سے روکتا ہے، مضبوط صبر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس صبر کی مشق روزے سے حاصل ہوتی ہے اور پھر اسی صبر سے وہ تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو روزے کا اصل مقصود ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. (البقرہ ۲: ۱۸۳)

''اے ایمان والو، تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔''

تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو، یعنی تاکہ صبر اور برداشت کی تربیت سے تمھاری قوت ارادی مضبوط ہو اور تمام ترغیبات و تحریکات اور تمام مشکلات و موانع کا مقابلہ کر کے تم شریعت کے حدود پر قائم رہ سکو۔

یہی قوت مومن کے ہاتھ میں وہ ہتھیار ہے جس سے وہ شیطان کے ہر وار کو روک سکتا ہے جو وہ خواہشات و جذبات اور شہوات کی راہ سے اس پر کرتا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر اس حدیث میں، جو اوپر گزر چکی ہے، روزے کو ایک ڈھال کہا گیا ہے اور روزہ دار کو یہ ڈھال استعمال کرنے کی تعلیم یوں دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اس سے گالم گلوچ یا لڑائی جھگڑا شروع کر دے تو اس سے کہے کہ میں روزے سے ہوں۔

جذبۂ ایثار کی پرورش

روزے سے انسان کے اندر جذبۂ ایثار کی بھی پرورش ہوتی ہے اور یہ جذبہ انسان کے ان اعلیٰ جذبات میں سے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایک ہے جن سے ہزاروں نیکیوں کے لیے اس کے اندر حرکت پیدا ہوتی ہے۔ انسان جب روزے میں بھوکا پیاسا رہتا ہے اور اپنی دوسری خواہشوں کو بھی دبانے پر مجبور ہوتا ہے تو اس طرح اسے غریبوں، فاقہ کشوں، محتاجوں اور مظلوموں کے دکھ درد اور ان کے شب و روز کا اندازہ کرنے کا بذات خود موقع ملتا ہے۔ وہ بھوک اور پیاس کا مزہ چکھ کر بھوکوں اور پیاسوں سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ ان کی ضرورتوں اور تکلیفوں کو سمجھنے لگتا ہے اور پھر قدرتی طور پر اس کے اندر یہ جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر ان کے لیے کچھ کر سکتا ہے تو کرے۔ روزے کا یہ اثر ہر شخص پر اس کی استعداد و صلاحیت کے اعتبار سے پڑتا ہے، کسی پر کم پڑتا ہے، کسی پر زیادہ۔ لیکن جس شخص کے روزے میں روزے کی خصوصیات موجود ہیں، ان پر روزے کا یہ اثر پڑتا ضرور ہے۔ جن کا جذبۂ ایثار کمزور ہوتا ہے، روزہ کچھ نہ کچھ ان کو بھی متحرک کر دیتا ہے اور جن کے اندر یہ جذبہ قوی ہوتا ہے، ان کے لیے تو روزوں کا مہینا اس جذبہ کے ابھرنے کے لیے گویا موسم بہار ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تردستیاں اور فیض بخشیاں یوں تو ہمیشہ ہی جاری رہتی تھیں، لیکن رمضان کا مہینا تو گویا آپ کے جود و کرم کا موسم بہار ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

كان النبي صلى الله عليه و سلم أجود الناس بالخير و كان أجود ما يكون في رمضان. (بخاری، رقم ۶)	”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یوں تو عام حالات میں بھی سب سے زیادہ فیاض تھے، لیکن رمضان میں تو گویا آپ سراپا جود و کرم ہی بن جاتے۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآن مجید سے مناسبت

قرآن مجید کو روزے کی عبادت کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے۔ اس مناسبت کے سبب سے روزہ دار پر قرآن مجید کی خاص برکتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ روزے کی حالت میں بہت سے دنیاوی مشاغل کا بوجھ روزہ دار کے اوپر سے اترا ہوا ہوتا ہے اور نفس کے میلانات و رجحانات میں، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، روزے کے سبب سے بڑی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خاموشی، خلوت، غیر ضروری مصروفیتوں سے علیحدگی اور ترک و انقطاع کی ایک مخصوص زندگی، جو روزہ دار کو حاصل ہوتی ہے، قرآن کی تلاوت اور اس کے تدبر کے لیے کچھ خاص موزونیت رکھتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی وحی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت اتاری جب آپ غار حرا میں معتکف تھے۔ نیز قرآن مجید کے نزول کے لیے اللہ تعالیٰ نے رمضان کے مبارک مہینے کو منتخب فرمایا اور اس نعمت کی شکر گزاری کے لیے اس پورے مہینے میں روزے رکھنا امت پر فرض قرار دیا۔ بعض احادیث میں وارد ہے کہ رمضان

میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ہر شب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قراءت قرآن مجید کا مذاکرہ کرنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے اور جتنا قرآن مجید نازل ہو چکا ہوا ہوتا تھا، اس کا مذاکرہ فرماتے تھے۔ رمضان کی راتوں میں تراویح میں قرآن کے سننے اور سنانے کی جو اہمیت ہے، وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ یہ ساری باتیں شہادت دیتی ہیں کہ قرآن مجید کو روزوں سے اور روزوں کو قرآن مجید سے گہری مناسبت ہے۔

تبتل الی اللہ

روزے کی اصل غایت دل، دماغ، جسم اور روح سب کا اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا ہے۔ اسی چیز کو قرآن مجید میں تبتل الی اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مقام آدمی کو روزے سے حاصل ہوتا ہے اور اسی کو حاصل کرنے کے لیے روزے کے ساتھ اعتکاف کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اعتکاف اگرچہ ہر شخص کے لیے رمضان کے روزوں کی طرح ضروری چیز نہیں ہے ـــــ بلکہ یہ اختیاری عبادت ہے ـــــ لیکن تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر رمضان کے آخری عشرہ میں، جب کہ روح میں تجرد و انقطاع اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کی ایک خاص کیفیت و حالت پیدا ہو جاتی ہے، آدمی اعتکاف میں بیٹھ جائے تو اس سے روزے کا جو اصل مقصود ہے، وہ کمال درجہ حاصل ہوتا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں جو اہتمام فرماتے تھے، اس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس طرح فرماتی ہیں:

كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إذا دخل العشر أحيا الليل و أيقظ أهله و جدّ و شدّ المئزر. (مسلم، رقم ۱۱۷۴)

”جب رمضان کا آخری عشرہ آتا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم شب بیداری فرماتے، اپنے اہل و عیال کو بھی شب بیداری کے لیے اٹھاتے اور کمر کس کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کھڑے ہوتے۔“

(تزکیۂ نفس ۲۳۹-۲۴۷)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سیر و سوانح

محمد وسیم اختر مفتی

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

(۵)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوتاپا

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: مجھے خدیجہ کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی زوجہ سے سوتاپا محسوس نہیں ہوا حالاں کہ وہ میری شادی سے تین سال پہلے وفات پا چکی تھیں۔ میں نے ان کو نہیں دیکھا، آپ اکثر ان کا ذکر خیر کیا کرتے تھے، انھیں جنت میں موتیوں کے گھر کی بشارت دی۔ آپ جب بکری ذبح کرتے تو اس کے اعضا خدیجہ کی سہیلیوں کو بھیجتے۔ بسا اوقات میں کہتی: کیا خدیجہ کے علاوہ دنیا میں کوئی عورت نہیں؟ آپ ان کی تعریفیں کرتے کہ وہ ایسی تھیں، وہ ایسی تھیں۔ انھی سے میرے بچے ہوئے (بخاری، رقم ۳۸۱۷۔ مسلم، رقم ۶۳۵۸)۔ ایک بار حضرت خدیجہ کی بہن حضرت ہالہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئیں تو آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: یا اللہ! ہالہ بنت خویلد۔ حضرت عائشہ کو بہت جلن ہوئی اور کہا: آپ کیا قریش کی سرخ گالوں والی بوڑھی عورتوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اللہ نے آپ کو ان کا بہتر بدل دے دیا ہے۔ یہ سن کر (دوسری روایت: غصے سے) آپ کا چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا، اس قدر جتنا نزول وحی یا آندھی، طوفان کے آنے پر ہوتا تھا (بخاری، رقم ۳۸۱۸۔ مسلم، رقم ۶۳۶۳۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۲۱۰)۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں: میں نے سوچا، اب کبھی خدیجہ کی برائی نہیں کروں گی۔ ایک سیاہ فام عورت آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئی تو آپ نے بہت اچھی طرح اس کا استقبال کیا۔ حضرت عائشہ نے کہا: یا رسول اللہ، ایک حبشیہ کی

اس قدر آؤ بھگت؟ فرمایا: یہ خدیجہ کے پاس بہت آتی تھی۔ اچھی طرح میل ملاقات کرنا ایمان کا حصہ ہے۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہ یک وقت نو ازواج رہیں۔ آپ ہر بیوی کے پاس ایک دن رہتے۔ باقی ازواج مطہرات، البتہ باری والی زوجہ کے پاس اکٹھی ہو جاتیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ کی باری تھی، جب حضرت زینب (ابن ماجہ کی روایت کے مطابق) بلا اجازت ان کے حجرے میں داخل ہوئیں۔ (آپ کو معلوم نہ تھا کہ حضرت زینب موجود ہیں، اندھیرے میں) آپ نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ حضرت عائشہ بولیں: یہ زینب ہیں۔ آپ نے ہاتھ کھینچ لیا، اس پر ان دونوں میں تکرار ہونے لگی اور ان کی آوازیں بلند ہو گئیں۔ ادھر نماز کھڑی ہونے لگی تو حضرت ابوبکر نے آپ کو بلا لیا۔ حضرت عائشہ بولیں: ابھی نماز ادا کرنے کے بعد میرے والد مجھے خوب ڈانٹیں گے۔ ایسا ہی ہوا، حضرت ابوبکر نے انھیں سختی سے ڈانٹا، تم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح بولتی ہو؟ (مسلم، رقم ۳۸۱۶)۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے پاس آئے تو انھوں نے پوچھا: آج کہاں رہے؟ فرمایا: اے حمیرا! ام سلمہ کے پاس تھا۔ کہا: ام سلمہ سے آپ کا جی نہیں بھرتا؟ مجھے بتائیں، اگر آپ ایک وادی کے دو کناروں پر اتریں، ایک سے گھاس چرا لی گئی ہو اور دوسرے کنارے پر کوئی گھاس کھانے والا نہ آیا ہو، آپ جانور کہاں چرانا چاہیں گے؟ فرمایا: وہ جس کا سبزہ چکھا نہ گیا ہو۔ میں آپ کی دوسری عورتوں کی طرح نہیں۔ میرے علاوہ ہر عورت دوسرے مرد کے پاس رہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا دیے (بخاری، رقم ۵۰۷۷)۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

شاہ روم مقوقس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قبطی باندی ہدیہ کی۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ وہ حاملہ ہوئی تو مجھے پریشانی لگ گئی۔ ابراہیم کی ولادت ہوئی، لیکن ماریہ کو دودھ نہ آتا تھا۔ آپ نے بچے کے لیے دودھ دینے والی بھیڑ خریدی جس کا دودھ پی کر وہ موٹا اور سرخ وسفید ہو گیا۔ ایک دن آپ ابراہیم کو اپنی گردن پر اٹھا کر لائے اور پوچھا: عائشہ، بچے کی (مجھ سے) مشابہت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے سوتاپے کی وجہ سے کہا: مجھے تو (آپ سے) کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔ فرمایا: بچے کی صحت کے بارے میں کیا کہتی ہو؟ میں نے کہا: جو بھیڑوں کا دودھ پیتا ہو، پنپ ہی جاتا ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں ان عورتوں سے چڑتی تھی جو اپنا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیتی تھیں۔ میں کہتی تھی: بھلا کوئی عورت اپنے تئیں ہبہ کر سکتی ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: 'تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْھُنَّ وَتُئْوِیْۤ اِلَیْکَ مَنْ تَشَآءُ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکَ'، ''اے نبی، اپنی بیویوں میں

جس کو چاہیں، الگ رکھیں اور جسے چاہیں، اپنے پاس رکھیں۔ اور جسے چاہیں، الگ کرنے کے بعد واپس بلا لیں، اس میں بھی کوئی حرج نہیں'' (الاحزاب ۳۳: ۵۱) تو میں نے کہا: مجھے لگتا ہے، آپ کا رب آپ کی خواہش پوری کرنے میں جلدی کرتا ہے (بخاری، رقم ۴۷۸۸۔ مسلم، رقم ۳۶۲۱)۔ ابن حجر کہتے ہیں: کئی صحابیات نے اپنی جان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخشی، مگر آپ کسی ایک کو نکاح میں نہ لائے، کیونکہ یہ آپ کے منشا پر موقوف تھا۔ 'اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْکِحَھَا'، ''بشرطیکہ نبی اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں'' (الاحزاب ۳۳: ۵۰)۔ ابن حجر نے حضرت میمونہ کے واہبہ ہونے کا بھی رد کیا ہے۔

ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ نے اپنی باری کا دن حضرت عائشہ کو دے دیا تھا۔ چنانچہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے ہاں دو دن قیام فرماتے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: سودہ کے علاوہ کوئی عورت ایسی نہیں کہ میرا اس جیسے طور طریقے اختیار کرنے کو دل چاہا ہے، مگر ان میں بھی تندی تھی (مسلم، رقم ۳۶۱۹)۔

ایک بار حضرت صفیہ بنت حیی اور حضرت عائشہ میں جھگڑا ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے باپ کو برا بھلا کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: صفیہ، تم ابوبکر کو گالی دے رہی ہو۔

www.javedahmedghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عمر فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج آپس کے رشک و رقابت کی وجہ سے آپ سے روٹھ گئیں تو میں نے ان سے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں طلاق دیں تو بڑی امید ہے کہ ان کا رب انھیں، بدلے میں تم سے بہتر بیویاں دے دے، تو اسی مضمون کی آیت (التحریم ۶۶: ۵) نازل ہوگئی (بخاری، رقم ۴۹۱۶)۔

ایک سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے کے لیے حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کے نام قرعہ نکلا۔ رات کے سفر میں گفتگو کرنے کے لیے آپ حضرت عائشہ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ حضرت حفصہ کو اس پر رشک آیا، انھوں نے حضرت عائشہ سے کہا: تم میرے اونٹ پر سوار ہو جاؤ اور میں تمھارا اونٹ پکڑ لیتی ہوں۔ دیکھتی جاؤ! کیا بنتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ کے اونٹ کے پاس گئے اور حضرت حفصہ کو سلام کیا۔ رات بھر کے سفر کے بعد پڑاؤ کا وقت آیا تو حضرت عائشہ آپ سے دور رہ گئیں۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شکوہ تو نہ کر سکتی تھیں۔ اس لیے زمین پر اترتے ہی اپنے پاؤں اذخر گھاس میں ڈال دیے جس میں سانپ بچھوؤں کا بسیرا ہوتا ہے اور رنج کے باعث دعا کرنے لگیں: اے رب، ڈسنے کے لیے مجھ پر کوئی سانپ بچھو ہی مسلط کر دے (بخاری، رقم ۵۲۱۱۔ مسلم، رقم ۶۳۷۹)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک زوجہ (حضرت عائشہ) کے پاس تھے۔ اتنے میں ایک دوسری بی بی (حضرت زینب

یا حضرت صفیہ) نے کھانے سے پر رکابی بھیجی۔ اس اہلیہ (حضرت عائشہ) نے جس کے ہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے، لانے والے خادم کے ہاتھ پر ایک ضرب لگائی تو رکابی گر کر ٹوٹ گئی۔ آپ نے رکابی کے ٹکڑے اور گرا ہوا کھانا اکٹھا کیا اور فرمایا: تمھاری اماں (ام المومنین) کو رشک آ گیا تھا۔ خادم کو روک کر آپ نے گھر سے نئی رکابی دے کر رخصت کیا (بخاری، رقم ۵۲۲۵)۔

نماز کسوف

۱۰ھ (جون ۶۳۱ء) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے حضرت ابراہیم نے اٹھارہ (یا سولہ) ماہ کی عمر میں وفات پائی۔ اتفاق سے اس موقع پر سورج کو گرہن لگ گیا تو لوگوں نے اسے حضرت ابراہیم کا سوگ قرار دیا۔ آپ نے فرمایا: چاند سورج اللہ کی نشانیاں ہیں، کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے ان پر گرہن نہیں آتا۔ جب تم گرہن دیکھو تو اللہ سے دعا مانگو، تکبیریں کہو، نماز پڑھو اور صدقہ کرو (بخاری، رقم ۱۰۴۴۔ مسلم، رقم ۲۰۴۶)۔ پھر آپ نے نماز کسوف کی دو رکعتیں پڑھائیں، ہر رکعت میں تین رکوع (دوسری روایات: دو رکوع، چار رکوع) اور دو سجدے کیے۔ رکوع و قیام کو خوب لمبا کیا۔ نماز کے دوران میں پیچھے ہٹے، پھر آگے بڑھے۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر بتاتی ہیں کہ میں اپنی بہن حضرت عائشہ کے پاس گئی، وہ بھی کھڑی نماز پڑھ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا: لوگ کون سی نماز پڑھ رہے ہیں؟ انھوں نے سر اونچا کر کے سورج کی طرف اشارہ کیا اور سبحان اللہ کہا۔ میں نے کہا: یہ ایک آیت ہے؟ انھوں نے سر کی جنبش سے ہاں کا اشارہ کیا۔ نماز کے بعد میں نے پوچھا: آپ نے کیا ارشاد فرمایا؟ حضرت عائشہ نے آپ کا یہ فرمان سنایا: مجھے یہاں سے جنت و دوزخ دکھائی گئی اور عذاب قبر اور مسیح دجال کے فتنہ کے بارے میں وحی کی گئی (بخاری، رقم ۹۲۲، ۱۰۴۶۔ مسلم، رقم ۲۰۵۷)۔

۱۰ھ کا حج

اس برس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو امیر حج مقرر فرمایا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے پاس پڑی اون سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی کے اونٹوں کے ہار بٹے، آپ نے بذات خود یہ ہار ان کو پہنائے، ان کی کوہانیں داہنی جانب سے چیر کر قربانی کی علامت لگائی، انھیں میرے والد ابوبکر کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ کیا اور خود مدینہ میں تشریف فرما رہے (بخاری، رقم ۱۶۹۶)۔ مسروق نے حضرت عائشہ سے مسئلہ

دریافت کیا، ایک شخص (زیاد بن ابوسفیان) مصر میں بیٹھ کر قربانی کا جانور کعبہ بھیجتا ہے، اس کے گلے میں ہار ڈلواتا ہے۔اسی دن وہ احرام باندھ لیتا ہے اور حلال نہیں ہوتا، یہاں تک کہ حاجی مکہ میں احرام کھول لیتے ہیں۔حضرت عائشہ نے (تعجب سے) تالی بجائی اور کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قربانی کے جانوروں کے ہار بٹتی، آپ ہدی کعبہ کو بھیجتے اور حاجیوں کے واپس آنے تک آپ پر تعلقات زن وشو میں سے کچھ حرام نہ ہوتا (بخاری، رقم ۵۵۶۶۔ مسلم، رقم ۳۱۸۵)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض وفات

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ایک ماہ قبل ہم حجرۂ عائشہ میں جمع تھے کہ آپ نے فرمایا: میرا وقت قریب آ گیا ہے۔آپ نے نماز جنازہ اور تدفین کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے فرمایا: میرے قریبی اہل خانہ مجھے غسل دیں گے۔ مجھے میرے ہی کپڑوں، مصر کی سفید چادر یا یمنی کپڑے کا کفن دیا جائے۔ میری میت کو چار پائی پر لٹا کر قبر کے کنارے رکھ دیا جائے اور کچھ دیر کے لیے سب باہر نکل جائیں تاکہ جبریل، اسرافیل، میکائیل، ملک الموت اور باقی فرشتے دعا کر سکیں۔میرے اہل خانہ اور میری ازواج کے بعد عامۃ المسلمین گروہوں کی صورت میں حجرہ کے اندر آئیں، میرے لیے دعا کریں اور مجھے سلام بھیجیں۔ چیخ چلا کر مجھے تکلیف نہ دی جائے۔

صفر ۱۱ھ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کی ابتدا ہوئی تو آپ حضرت زینب بنت جحش کے گھر میں تھے۔اواخر صفر کی ایک نصف شب آپ نے اپنے غلام ابومویہبہ کو جگا کر جنت البقیع چلنے کے لیے کہا اور فرمایا: مجھے اہل بقیع کے لیے دعاے مغفرت کرنے کا حکم ہوا ہے۔دعا کرنے کے بعد فرمایا: مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ اس وقت تک زندہ رہوں، جب میری قوم کو فتوحات حاصل ہوں یا جلدی اپنے رب کے پاس بلا لیا جاؤں۔ میں نے تعجیل پسند کی ہے (مسند احمد، رقم ۱۵۹۹۷۔ مستدرک حاکم، رقم ۴۳۸۳)۔حضرت عائشہ فرماتی ہیں: جس وقت آپ بقیع سے واپس آئے، میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ میں نے ہائے میرا سر! کہا تو فرمایا: نہیں عائشہ! میرا سر بھی دکھ رہا ہے۔آپ نے ازراہ مزاح فرمایا: اگر تو مجھ سے پہلے فوت ہوگئی تو میں تمھیں کفن دے کر، جنازہ پڑھ کر دفنا دوں گا۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا: تب تو آپ میرے ہی گھر میں اپنی دوسری اہلیہ لے آئیں گے (بخاری، رقم ۵۶۶۶۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۹۰۸)۔آپ مسکرائے، لیکن سر کا درد برقرار رہا۔ یہ آپ کے مرض وفات کی ابتدا تھی، جس

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

روز تکلیف بڑھی، آپ سیدہ میمونہ کے گھر میں تھے۔ آپ بار بار پوچھتے: میں کل کہاں رہوں گا؟ (بخاری، رقم ۵۲۱۷۔ مسلم، رقم ۳۶۷۳)۔ آخرکار، تمام ازواج مطہرات کو بلا کر کہا: میرے لیے باری باری تم سب کے گھر جانا مشکل ہو گیا ہے، اس لیے اجازت دو کہ ایام علالت ایک کے گھر گزار لوں۔ حضرت ام سلمہ نے کہا: ہمیں سمجھ آ گیا ہے کہ آپ عائشہ کے پاس رہنا چاہتے ہیں۔ ہماری طرف سے اجازت ہے (بخاری، رقم ۳۰۹۹)۔ حضرت علی اور حضرت فضل بن عباس کا سہارا لیتے ہوئے آپ حجرۂ سیدہ عائشہ میں تشریف لائے (بخاری، رقم ۴۴۴۲)۔ حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہ آپ کی تیمارداری میں بعد میں بھی شریک رہیں۔ اسی مرض کے دوران میں آپ نے فرمایا: اے عائشہ، میں خیبر میں کھائے ہوئے زہریلے کھانے کی تکلیف برابر محسوس کرتا رہا ہوں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس زہر کے اثر سے مجھے اپنی شہ رگ کٹنے کا احساس ہو رہا ہے (بخاری، رقم ۴۴۲۸)۔

درد میں اضافہ ہوا تو فرمایا: مجھ پر سات منہ بند بھری ہوئی مشکوں کا پانی بہاؤ، ہو سکتا ہے، میں لوگوں سے کچھ بات کروں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ہم نے حفصہ کے طشت میں آپ کو بٹھا کر پانی بہایا، حتیٰ کہ آپ نے فرمایا: بس! کافی ہے (بخاری، رقم ۱۹۸)۔ پھر سر باندھ کر حجرے سے باہر گئے۔ نماز پڑھا کر منبر پر تشریف فرما ہوئے، پہلے اصحاب احد کے لیے دیر تک دعاے مغفرت کی، پھر فرمایا: اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو اللہ نے اختیار دیا ہے کہ دنیا میں رہے یا اس کے پاس آ جائے تو اس نے اللہ کا قرب پسند کر لیا ہے۔ حضرت ابوبکر آپ کی بات سمجھ کر رونے لگ گئے تو ان کو تسلی دی اور فرمایا: مسجد میں کھلنے والے سب دروازوں کو بند کر دو، سوائے دریچۂ ابوبکر کے (بخاری، رقم ۶۶۵)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد سے واپس آئے تو حضرت عائشہ کی گود میں لیٹ گئے اور معوذات پڑھ کر اپنے دست مبارک سے دم کرنے لگے۔ یہ آپ کا پہلے سے معمول تھا۔ جب مرض شدید ہو گیا تو سیدہ عائشہ معوذتین پڑھتیں اور آپ کا ہاتھ پکڑ کے آپ کے جسم مبارک پر پھیرتی رہیں (بخاری، رقم ۴۴۳۹۔ مسلم، رقم ۵۷۶۶)۔ افاقہ ہوتا تو آپ اپنی چادر منہ پر اوڑھ لیتے اور جب تکلیف ہوتی تو اسے چہرے سے ہٹا دیتے۔ اسی کیفیت میں آپ نے فرمایا: اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا (بخاری، رقم ۴۳۵۔ مسلم، رقم ۱۱۲۴)۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو (جب آپ ہوش میں نہ تھے) دوا پلائی تو آپ اشارہ کرتے رہے کہ مجھے دوا نہ پلاؤ۔ ہم نے یہی سمجھا کہ ہر بیمار آدمی دوا پینے سے کراہت محسوس کرتا ہے، جب آپ کو ہوش آیا تو فرمایا: میں نے تمھیں دوا پلانے سے روکا نہ تھا۔ ہم نے کہا: سب مریض دوا پینے سے انکار کرتے ہیں۔ فرمایا: میری آنکھوں

www.al-mawrid.org www.javedahmedghamidi.com

کے سامنے گھر میں موجود ہر فرد کو (تادیباً) دوا پلائی جائے۔ عباس کو رہنے دیا جائے، کیونکہ وہ تمھارے ساتھ موجود نہ تھے (بخاری، رقم ۴۴۵۸۔ مسلم، رقم ۵۸۱۳)۔ دوسری روایت میں آپ کا یہ ارشاد نقل ہوا: یہ ان عورتوں کا کام ہے جو وہاں (حبشہ) سے آئی ہیں۔ (مصنف عبدالرزاق:) وفات سے پہلے آپ کا سر مبارک حضرت عائشہ کی چھاتی اور گردن کے درمیان ٹکا ہوا تھا اور دہن مبارک حضرت عائشہ کے منہ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ فرماتی ہیں: آخری لمحات میں آپ اپنے پاس پڑے پانی کے برتن میں ہاتھ ڈالتے اور چہرے پر پھیر لیتے اور فرماتے: ''لا الٰہ الا اللہ! بے شک موت کی بہت سختیاں ہیں'' (بخاری، رقم ۴۴۴۹۔ ترمذی، رقم ۹۷۸۔ سنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۱۷۰۱)۔ آپ نے فرمایا: میری شدت تکلیف کو اس بات نے کم کر دیا کہ میں نے جنت میں عائشہ کی ہتھیلی کی چمک دیکھی (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۰۷۶)۔ وفات سے کچھ دیر پہلے میرے بھائی عبدالرحمٰن بن ابوبکر ہاتھ میں تر مسواک پکڑے آئے۔ آپ کی نظر مسواک پر پڑی تو مجھے خیال آیا کہ آپ مسواک کرنا بہت پسند کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا: کیا مسواک دوں؟ آپ نے سر کے اشارے سے ہاں کیا تو میں نے مسواک لے کر اسے دانتوں سے کاٹا پھر چبا کر نرم کیا اور آپ کو دے دی۔ آپ نے اسی حالت میں، میرے سینے سے لگے، اچھی طرح مسواک کی۔ مسواک واپس دینے لگے تھے کہ وہ آپ کے ہاتھ سے گر گئی (بخاری، رقم ۴۴۵۱۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۶۴۰)۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں جان، جان آفریں کے سپرد کی کہ آپ کا سر میری ہنسلیوں اور ٹھوڑی کے مابین ٹکا ہوا تھا۔ آپ کی بیماری کے دوران میں جبریل جو دعا کرتے تھے، میں بھی وہ دعا کرتی رہی۔ آپ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی، انگشت شہادت بلند کی اور فرمایا: 'في الرفيق الأعلىٰ، اللّٰهم الرفيق الأعلىٰ'، ''اعلیٰ رفیق کی معیت میں، اے اللہ، اعلیٰ ہم راہی''! یہ آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونے والا آخری کلمہ تھا (بخاری، رقم ۳۶۶۹۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۲۱۶)۔ دوسری روایت کے الفاظ ہیں: 'اللّٰهم اغفر لي وارحمني وألحقني بالرفيق'، ''اے اللہ مجھے بخش دے، مجھ پر رحم کر اور مجھے اپنے رفیق سے ملا دے'' (بخاری، رقم ۴۴۴۰۔ مسلم، رقم ۶۳۴۷)۔ نسائی اور بیہقی کی روایات میں آپ کی دعا اس طرح ہے: 'اللّٰهم اغفرلي وارحمني، في الرفيق الأعلىٰ الاسعد مع جبريل وميكائيل وإسرافيل'، ''اے اللہ مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کر۔ اعلیٰ، خوش بخت ہم راہی کے ساتھ، جبریل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام کی معیت میں'' (السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۷۰۴، ۱۰۹۳۶۔ دلائل النبوۃ، بیہقی: ۷/ ۲۰۹)۔ آپ کے آخری سانس نکلے تو مجھے ایسی عمدہ خوشبو آئی جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۹۰۵)۔

'الرفيق الأعلىٰ' کی وضاحت حضرت عائشہ کی اس روایت سے ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تندرست

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تھے، فرمایا کرتے تھے: کسی نبی کی جان اس وقت تک قبض نہیں کی جاتی، جب تک اسے جنت میں اس کا مقام دکھا نہیں دیا جاتا، پھر اسے اختیار دیا جاتا ہے، زندہ رہے یا آخرت کو اختیار کر لے۔ آخری مرض میں جب آپ کی آواز بھاری ہو چکی تھی، میں نے آپ کو یہ آیت تلاوت کرتے سنا: 'مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا'، ''ان لوگوں کی معیت میں جن پر اللہ نے انعام کیا ہے، یعنی انبیا، صدیقوں کا گروہ، شہدا اور صالحین، ساتھی ہونے میں یہ لوگ کتنے ہی اچھے ہیں'' (النساء ۴: ۶۹) تو سمجھ آ گیا کہ آپ کا اختیار دریافت کر لیا گیا ہے (بخاری، رقم ۴۴۳۷۔ مسلم، رقم ۶۳۷۸۔ مسند طیالسی، رقم ۱۴۵۶)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی پر تکلیف نہ آئی ہو گی (بخاری، رقم ۵۶۴۶۔ مسلم، رقم ۶۶۴۹)۔ آپ کے بعد اب مجھے کسی کی موت کی سختی محسوس نہیں ہوتی (بخاری، رقم ۴۴۴۶)۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میری نادانی اور کم عمری دیکھو، میں نے آپ کا سر تکیے پر رکھ دیا اور عورتوں سے مل کر سینہ کوبی کرنے اور اپنا چہرہ پیٹنے لگی۔

حضرت عائشہ سے پوچھا گیا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے حق میں وصیت کی؟ انھوں نے کہا: وفات کے وقت آپ کا سر میری گود میں تھا تو آپ نے کس وقت وصیت فرمائی؟ آپ نے طشت منگوایا اور میری گود میں جھک کر لٹک گئے۔ مجھے آپ کی جان نکلنے کی خبر بھی نہ ہو سکی تو آپ نے علی کو وصی کس وقت بنایا؟ (بخاری، رقم ۱۴۷۲۔ مسلم، رقم ۴۲۴۰۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۰۳۹)۔ آپ کا آخری حکم تھا: جزیرۂ عرب میں دو دین نہ رہنے دیے جائیں۔ ایسی روایات بھی پائی جاتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری وقت میں حضرت علی کو بلایا۔ انھوں نے آپ کو سینے سے لگایا ہی تھا کہ آپ کی وفات ہو گئی۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک حجرۂ عائشہ میں اسی مقام پر بنائی گئی، جہاں آپ نے وفات پائی تھی۔ آپ کا بستر اٹھا کر اس کے نیچے قبر کھودی گئی۔ مرض وفات کے دوران میں آپ نے فرمایا تھا: اللہ یہود پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: اگر یہ ڈر نہ ہوتا کہ آپ کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیا جائے گا، آپ کی تدفین حجرۂ مبارکہ سے باہر کی جاتی (بخاری، رقم ۴۴۴۱۔ مسلم، رقم ۱۱۲۱)۔ حضرت عائشہ ہی کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل دینے کا موقع آیا تو صحابہ باہم مشورہ کرنے لگے۔ آپ کے کپڑے اتار کر غسل دیا جائے یا کپڑوں سمیت؟ اسی اثنا میں سب پر نیند طاری ہو گئی اور غیبی متکلم نے آواز دی کہ نبی کو کپڑوں سمیت غسل دو۔ حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین کی خبر بدھ کی نصف رات کو ہوئی، جب ہم نے بیلچوں کے چلنے کی آواز سنی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ابو بردہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے مجھے ایک موٹا یمنی تہ بند اور ایک اونی چادر (ملبدہ) دکھائی اور بتایا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ان کپڑوں میں ہوئی تھی (بخاری، رقم ۳۱۰۸۔ مسلم، رقم ۵۴۹۳۔ ابوداؤد، رقم ۴۰۳۶)۔ حضرت عائشہ کے پاس ایرانی سبز چادر کا ایک جبہ تھا جس کے کالر (گریبان) اور دامن پر موٹا ریشم لگا ہوا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے پہنا کرتے تھے۔ حضرت عائشہ کی وفات کے بعد یہ حضرت اسماء بنت ابوبکر کو مل گیا (مسلم، رقم ۵۴۶۰)۔

حضرت ابوبکر کا متوقع خلیفۂ رسول ہونا

حضرت عائشہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں فرمایا: ابوبکر اور ان کے بیٹے کو بلا لو تاکہ کوئی طمع کرنے والا امر خلافت میں طمع نہ کرے اور کہے کہ میں زیادہ حق دار ہوں، پھر فرمایا: اللہ اور اہل ایمان ایسا نہ کرنے دیں گے (بخاری، رقم ۵۶۶۶۔ مسلم، رقم ۶۲۵۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۷۵۱)۔ یہ روایات ایسے ہی مضمون پر مشتمل دوسری کئی روایات کے برعکس ہیں جن میں حضرت علی کا وصی ہونا بتایا گیا ہے۔ حضرت بلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی اطلاع دینے آئے تو فرمایا: ''ابوبکر کو کہو، لوگوں کو نماز پڑھائیں۔'' حضرت عائشہ نے کہا: ''یارسول اللہ! ابوبکر رقیق القلب ہیں۔ جب آپ کی جگہ (نماز پڑھانے) کھڑے ہوں گے، گریہ کی وجہ سے لوگوں کو (تلاوت) سنا نہ پائیں گے۔ آپ عمر سے کیوں نہیں کہتے؟'' پھر حضرت عائشہ نے حضرت حفصہ سے کہا: یہ بات آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کریں۔ حضرت حفصہ سے یہ مشورہ دوبارہ سننے پر آپ نے فرمایا: ''تم تو بالکل یوسف کی ساتھی عورتوں جیسی ہو (اپنے دل کی بات چھپا کر رکھتی ہو۔ جس طرح زلیخا نے عورتوں کی ضیافت بظاہر ان کی عزت افزائی کے لیے کی، مقصد انھیں حسن یوسف سے مرعوب کر کے اپنی محبت کی صفائی پیش کرنا تھا ایسے ہی حضرت عائشہ نے حضرت ابوبکر کی نرم دلی کا ذکر کر کے امامت حضرت عمر کو سونپنے کی تجویز دی، مقصد ان کو بار خلافت سے بچانا تھا)۔ ابوبکر کو کہو، لوگوں کو نماز پڑھائیں۔'' حضرت حفصہ کو ڈانٹ پڑی تو حضرت عائشہ سے گلہ کیا: مجھے تم سے بھلائی ملنے والی نہیں (بخاری، رقم ۷۳۰۳)۔ حضرت عائشہ نے اس معاملے کی وضاحت اس طرح کی کہ میں نہ سمجھتی تھی کہ جو شخص آپ کا قائم مقام ہوگا، لوگ اس سے ہمیشہ محبت ہی کریں گے۔ میرا خیال تھا کہ لوگ آپ کے جانشین کو سبز قدم سمجھنا شروع ہو جائیں گے، اس لیے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر کا خیال چھوڑ دیں (بخاری، رقم ۴۴۴۵۔ مسلم، رقم ۹۳۰، ۹۴۳)۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے ایک نماز پڑھائی تو آپ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نے حضرت ابوبکر کو بلانے کا حکم دیا (ابوداؤد، رقم ۴۶۶۰)۔ حضرت ابوبکر نماز پڑھا رہے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ افاقہ محسوس ہوا۔ آپ حضرت عباس اور ایک صحابی کا سہارا لیتے ہوئے مسجد میں آئے۔ حضرت ابوبکر نے پیچھے ہٹنا چاہا، لیکن آپ نے انھیں اپنی جگہ پر رہنے کا اشارہ کیا۔ آپ ان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر آپ کی اقتدا کرنے لگے اور لوگ حضرت ابوبکر کی امامت میں نماز پڑھنے لگے (بخاری، رقم ۶۸۶)۔ پیر کے دن صحابہ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ نے حجرۂ عائشہ کا پردہ ہٹا کر دیکھا اور اہل ایمان کو صفوں میں دیکھ کر مسکرائے۔ حضرت ابوبکر یہ سمجھ کر کہ آپ آنے لگے ہیں، پہلی صف کی طرف ہٹنے لگے، لیکن آپ نے نماز جاری رکھنے کا اشارہ کیا اور پردہ گرا کر حجرے میں واپس تشریف لے گئے۔ یہ آپ کی حیات دنیوی کا آخری دن تھا (بخاری، رقم ۶۸۰)۔

وراثت رسول اور امہات المومنین

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت عائشہ کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ جس طرح حضرت فاطمہ آپ کی وارث تھیں، اسی طرح حضرت عائشہ بھی وراثت نبوی میں حصہ رکھتی تھیں۔ حضرت ابوبکر نے آپ کے اس فرمان پر عمل کرتے ہوئے کہ شریعت اسلامی میں انبیا کی وراثت جائز نہیں، دونوں کو کوئی حصہ نہ دیا۔ البتہ مال فے سے ان کا نفقہ اور خرچہ اسی طرح نکالتے رہے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکالا کرتے تھے (ترمذی، رقم ۱۶۰۸)۔

حضرت عائشہ خود روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی ازواج نے حضرت عثمان کو خلیفۂ اول حضرت ابوبکر کے پاس حصول وراثت کے لیے بھیجنا چاہا تو حضرت عائشہ نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد نہیں، ہم گروہ انبیا وراثت نہیں چھوڑتے۔ ہمارا ترکہ صدقہ شمار ہوتا ہے (بخاری، رقم ۶۷۳۰۔ مسلم، رقم ۴۶۰۰)۔

حضرت فاطمہ اور حضرت عباس میراث نبوی میں سے فدک اور خیبر کا حصہ مانگنے حضرت ابوبکر کے پاس گئے (بخاری، رقم ۶۷۲۵۔ مسلم، رقم ۴۶۰۲) تو انھوں نے فرمایا: آل محمد کے لیے اللہ کے مال میں سے کھانے پینے کے خرچ سے زیادہ لینا جائز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: میری ازواج کے نان ونفقہ کے بعد جو بچ رہے، صدقہ کر دیا جائے (مسلم، رقم ۴۶۰۴)۔ واللہ! میں عہد نبوت میں ان کو دیے جانے والے وظائف میں ہرگز تبدیلی نہ کروں گا اور وہی طریقہ جاری رکھوں گا جس پر آپ نے عمل فرمایا۔ مجھے خدشہ ہے کہ آپ کے کسی بھی عمل کو چھوڑا تو بھٹک جاؤں گا (بخاری، رقم ۳۷۱۲۔ مسلم، رقم ۴۶۰۳)۔ حضرت فاطمہ اس بات پر ناراض ہو گئیں اور ان سے بول چال

ترک کر دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چھ ماہ بعد ان کا انتقال ہوا تو حضرت علی نے حضرت ابوبکر کو اطلاع دیے بغیر راتوں رات ان کی تدفین کر دی (بخاری، رقم ۴۲۴۰۔ مسلم، رقم ۴۶۰۱)۔ عامر شعبی کی روایت ہے کہ سیدہ فاطمہ کے مرض وفات میں حضرت ابوبکر ان کے گھر گئے اور یہ کہہ کر انھیں منا لیا کہ میں نے جو فیصلہ کیا، اس سے اللہ، رسول اور اہل بیت کی رضا جوئی مقصود تھی (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۲۷۳۵)۔ یعقوبی کا بیان ہے کہ جب سیدہ عائشہ نے اعتراض کیا: آپ تو اپنے باپ کی وراثت حاصل کر سکتے ہیں اور میں نہیں کر سکتی تو حضرت ابوبکر زار و قطار رونے لگے، گویا اس اعتراض پر محض ہم دردی ہی کی جا سکتی تھی۔ ایسی روایت بھی پائی جاتی ہے کہ جب حضرت ابوبکر نے وراثت سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بتایا تو حضرت علی نے اللہ کا یہ فرمان 'وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ'، 'اور سلیمان نے داؤد کی وراثت پائی' (النمل ۲۷:۱۶) سنایا اور حضرت زکریا کی دعا پر مشتمل یہ آیت 'يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ'، 'جو میرا وارث ہو اور اولاد یعقوب کی وراثت پائے' (مریم ۱۹:۶) پڑھ دی۔ تب وہ خاموش ہو گئے۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الجامع المسند الصحیح المختصر (بخاری، شرکۃ دار الارقم) المسند الصحیح المختصر من السنن (مسلم، شرکۃ دار الارقم)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، احکام القرآن (ابن عربی)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ، امین اللہ وثیر)، Wikipedia, the free encyclopedia۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مقالات

ڈاکٹر عرفان شہزاد

حضرت موسیٰ اور حضرت عمر کی شخصی و فکری مماثلتیں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے درمیان بہت سی طبعی اور مزاجی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر حضرت عمر کو حضرت موسیٰ سے مشابہ قرار دیا تھا۔ غزوۂ بدر کے قیدیوں کے بارے میں مشورہ کرنے پر حضرت عمر کی طرف سے جب یہ رائے پیش کی گئی کہ انھیں قتل کر دیا جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ''اے عمر تمھاری مثال موسیٰ کی طرح ہے۔ موسیٰ نے دعا کی تھی، کہا: اے ہمارے رب، ان کے مال (اب) غارت کرے اور ان کے دلوں کو اس طرح بند کر دے کہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔''
>
> (مصنف ابن ابی شیبہ ۷/ ۳۴۹)

دونوں شخصیات غیرت و حمیت، جرأت و بہادری، عقل و بصیرت، حریت فکر، جرأت اظہار اور قائدانہ کردار کا مجسم استعارہ ہیں۔

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے قصے میں حضرت خضر کی کارروائیوں پر فطرت انسانی اور دین و شریعت میں گندھے مزاج کے سبب سے حضرت موسیٰ کی عدم برداشت اور دوسری طرف مختلف مواقع پر دین و شریعت کے معاملات میں حضرت عمر کی غیرت کے مظاہر ایک جیسے مزاج کا پتا دیتے ہیں۔

حضرت موسیٰ خدا کے حکم کے سامنے اپنی عقل کے استعمال اور خدا کی موجودگی میں اپنے خیالات کے اظہار میں جھجکتے نہیں، اسی طرح حضرت عمر، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور ہدایات کے باوجود اپنی عقل سے کام لینے اور اپنی رائے کے اظہار سے چوکتے نہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں حضرات کو خدا اور رسول جیسی اتھارٹیز کے سامنے ان کے احکام اور آرا آ جانے کے بعد بھی اپنی عقل کے استعمال اور اپنی رائے کے اظہار پر ان کی طرف سے تائید و پذیرائی ملتی ہے۔

مثلاً، خدا نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ فرعون کی طرف جاؤ اور اسے دین کی تبلیغ کرو اور خدا کی طرف سے تنبیہ کرو۔ حضرت موسیٰ نے حکمِ خدا پر سیدھے سیدھے عمل کرنے سے پہلے کچھ معاملات طے کر لینا ضروری سمجھا۔ انھوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ ان کے ہاتھ سے فرعون کی قوم کا ایک شخص غلطی سے قتل ہو گیا تھا، انھیں ڈر ہے کہ فرعون اس جرم میں انھیں قتل کرا دے گا؛ دوسرا، یہ فرمایش کی کہ ان کے بھائی، حضرت ہارون کو بھی نبوت عطا کی جائے، اور وجہ بھی خود بیان کی کہ وہ ان سے زیادہ فصیح اللسان ہیں، تبلیغ دین میں وہ ان کی معاونت اچھے سے کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی درخواست قبول کی اور تسلی بھی دی کہ فرعون ان پر قابو نہ پا سکے گا، بلکہ وہی غالب رہیں گے۔ اس سب کے بعد خدا نے پھر فرمایا کہ اب جاؤ فرعون کی طرف۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

غور کیجیے کہ خدا کا حکم ملنے کے بعد بھی حضرت موسیٰ کی حریت فکر ان سے کیا کراتی ہے۔ یہ خدا سے ان کی پہلی براہ راست ملاقات تھی اور ایسے میں ان کے ہوش و حواس قائم رہنا ان کے نہایت مضبوط اعصاب اور ناقابل تسخیر حریت و خود اعتمادی کی عکاسی کرتا ہے۔ ادھر خدا بھی ان کی اس جرأت بیان پر ناراض ہونے کے بجائے اسے قبولیت بخش کر اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ خدا چاہتا تو حضرت موسیٰ کی طلب سے پہلے ہی تمام لوازمات مہیا کر دیتا، تمام خدشات دور کر دیتا، لیکن خدا بھی گویا چاہتا ہے کہ اس کا بندہ، محض حکم کا غلام ہی نہ بن کر رہ جائے، خدا کی دی ہوئی عقل کا استعمال کرنا بھی جانتا ہو۔

انبیا علیہم السلام حکم کے بندے تھے، لیکن صاحب عقل و اجتہاد بھی تھے۔ انبیا کو اجتہاد کی بھلا کیا ضرورت ہو سکتی تھی، جب کہ ان کو خدا کی طرف سے براہ راست ہدایت کا ذریعہ میسر تھا، ان کے لیے ممکن ہو سکتا تھا کہ جو مسئلہ بھی انھیں درپیش ہوتا، اس کے لیے انھیں خدا کی طرف سے براہ راست ہدایات مل جایا کرتیں، اپنی عقل کے استعمال کی آزمایش، جس میں خطا کا امکان رہتا ہے، کی نوبت ہی نہ آتی، خصوصاً دین جیسے نازک معاملے میں، دینی اصولوں کے اطلاق میں عقل کے اس خاطی ذریعہ کا استعمال نہ کیا جاتا، لیکن خدا نے انبیا کے معاملے میں بھی ایسا نہیں چاہا۔

اس نے انھیں ہر ہر معاملے میں رہنمائی دینے کے بجاے انھیں اپنی راے بنانے اور اجتہاد کرنے کا موقع بھی دیا۔ اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ ہوتا ہے، یعنی اس میں ان سے خطائیں بھی ہوئیں، جس کی اصلاح پھر خدا نے کی: آدم علیہ السلام نے ممنوعہ پھل کھا لیا اور جنت سے نکالے گئے؛ یونس علیہ السلام وقت سے پہلے اپنی بستی چھوڑ کر نکل گئے اور مچھلی کے پیٹ میں قید کر دیے گئے؛ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کے موقع پر منافقین کی جنگ میں عدم شرکت کے ان کے اعذار قبول کر لیے، جب کہ خدا کی اسکیم یہ تھی کہ اس موقع پر مومن اور منافق علیحدہ ہو جائیں تاکہ ان منافقین کے بارے میں ان کی تباہی کا آخری فیصلہ نافذ کر دیا جائے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کریم النفسی سے ان کی معذرت قبول کر کے انھیں پیچھے ٹھیرنے کا جواز فراہم کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا:

عَفَا اللّٰهُ عَنۡكَ لِمَ اَذِنۡتَ لَهُمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيۡنَ صَدَقُوۡا وَتَعۡلَمَ الۡكٰذِبِيۡنَ.

''اللہ تم کو معاف کرے، (اے پیغمبر)، تم نے (اِس سفر سے) انھیں رخصت کیوں دے دی؟ (تمھیں چاہیے تھا کہ ایسا نہ کرتے)، یہاں تک کہ تم پر کھل جاتا کہ کون سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔'' (التوبہ ۹: ۴۳)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ادھر حضرت عمر کے معاملے کو دیکھیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صلح حدیبیہ کے موقع پر ان کو قریش کے پاس مذاکرات کے لیے بھیجنا چاہتے تھے۔ حضرت عمر کا خاندان سفارت کاری میں مشہور چلا آتا تھا، وہ خود بھی اس فن میں طاق تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب درست تھا، لیکن حضرت عمر نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر سیدھے سیدھے عمل کرنے کے بجاے ایک تجویز، جسے وہ بہتر سمجھ رہے تھے، آپ کے سامنے پیش کرنا مناسب سمجھا۔ آپ نے عرض کیا کہ مکہ میں ان کا خاندان کم زور ہے۔ قبائلی عصبیت کی بنا پر جو تحفظ فرد کو اس سماج میں حاصل ہوا کرتا تھا، اس کے لحاظ سے ان کا کم زور قبیلہ، قریش کے دیگر طاقت ور قبیلوں کے مقابلے میں ان کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا، بہت ممکن تھا کہ قریش مسلمانوں کے ساتھ موجودہ دشمنی کی وجہ سے ان کی جان کو نقصان پہنچائیں، ایسا اگر ہو جاتا تو ان کی جان بھی جاتی اور سفارت کا مقصد بھی حاصل نہ ہو پاتا، الٹا حضرت عمر کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے جنگ کی نوبت آ جاتی۔ اس صورتِ حال میں حضرت عمر نے اس سفارت کاری کے لیے حضرت عثمان کا نام تجویز کیا، کیونکہ وہ بنو امیہ سے تھے اور قریش، مسلمانوں سے دشمنی کے باوجود مکہ میں بنو امیہ کے طاقت ور قبیلے کے ہوتے ہوئے حضرت عثمان کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ قبائلی عصبیت کی بنا پر ایک قبیلے کے لوگ ہر

حال میں دوسرے قبائل کے مقابلے میں اپنے افراد کا تحفظ کیا کرتے تھے، خصوصاً اس صورت میں، جب کہ معاملہ جنگ کا بھی نہیں تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ صورت حال ایسی ہی تھی۔ قریش کی دشمنی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ انھوں نے حضرت عثمان کو بھی روک لیا تھا، حتیٰ کہ ان کی شہادت کی افواہ اڑی، اسی بنا پر بیعت رضوان ہوئی اور مسلمان ان کا بدلہ لینے کے لیے جنگ کرنے پر تیار ہو گئے، پھر اس کے بعد صلح حدیبیہ ہوئی۔ چنانچہ حضرت عمر کا خدشہ، کہا جا سکتا ہے کہ درست تھا۔ حضرت عثمان کے ساتھ اگر یہ ہوا تھا تو حضرت عمر کے ساتھ اور کیا نہ ہو جاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حضرت عمر کے اس عذر اور تجویز کو منظور کر کے ان کی اس حریت فکر کو سند جواز عطا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر قرآن مجید میں فرمایا کہ مصلحت اسی میں تھی کہ اس وقت جنگ نہ ہو۔ اور اللہ نے جنگ ہونے نہیں دی:

وَهُوَ الَّذِیْ کَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَکَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَکُمْ عَلَیْهِمْ وَکَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرًا. (الفتح ۴۸: ۲۴)

”وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں اُن کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ اُن سے روک دیے، اِس کے بعد کہ اُس نے تم کو اُن پر غلبہ عطا کر دیا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے، اللہ اُسے دیکھ رہا تھا۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

غور طلب بات یہ ہے کہ خدا کی یہ مرضی پوری کرنے کے لیے حضرت عمر کی فراست کام میں آئی، کیونکہ اگر وہ اپنی رائے کا اظہار نہ کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو معقول جان کر قبول نہ کر لیتے اور وہ کفار کے ہاتھوں شہید ہو جاتے تو جنگ ہو کر رہتی۔

اب حضرت موسیٰ کا ایک واقعہ دیکھیے، جب بنی اسرائیل نے گاے کے بچھڑے کی پرستش کے گناہ عظیم کا ارتکاب کیا تو قوم کی اجتماعی توبہ کے لیے بنی اسرائیل کے ۷۰ سرداروں کو لے کر حضرت موسیٰ کوہ طور پہنچے تو خدا نے ایک زلزلہ برپا کیا۔ یہ خدا کے جلال کا ظہور تھا۔ اس موقع پر حضرت موسیٰ نے جو دعا کی، وہ ایک سادہ دعا ہی نہیں ہے، بلکہ پورا آرگیومنٹ ہے۔ نیچے دیے گئے اس دعا کے ترجمے کے خط کشیدہ الفاظ دیکھیے کہ وہ کس طرح خدا سے اس کے اس فعل کے مضمرات اور نتائج بیان کر کے باقاعدہ دلائل کے ساتھ اس سے اس کی رحمت کی درخواست کرتے ہیں:

وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَکْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِیَّایَ اَتُهْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ

”اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمی منتخب کیے تاکہ وہ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر حاضر ہوں۔ پھر جب (وہ حاضر ہوئے اور) اُن کو زلزلے نے آ پکڑا

السُّفَهَآءُ مِنَّا اِنۡ هِیَ اِلَّا فِتۡنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنۡ تَشَآءُ وَتَهۡدِیۡ مَنۡ تَشَآءُ اَنۡتَ وَلِیُّنَا فَاغۡفِرۡلَنَا وَارۡحَمۡنَا وَاَنۡتَ خَیۡرُ الۡغٰفِرِیۡنَ. (الاعراف ۷:۱۵۵)

تو موسیٰ نے کہا: پروردگار، اگر تو چاہتا تو پہلے ہی اِن کو اور مجھے ہلاک کر دیتا۔ کیا تو ایک ایسے کام پر ہمیں ہلاک کرے گا جو ہمارے اندر کے احمقوں نے کیا ہے؟ یہ سب تیری آزمایش ہی تھی۔ تو اِس سے جس کو چاہے (اپنے قانون کے مطابق) گمراہی میں ڈال دے اور جس کو چاہے، ہدایت بخش دے۔ تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ سو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما، تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔‘‘

حضرت موسیٰ سے بڑھ کر خدا شناسی کا دعویٰ کون کرسکتا ہے جن کو خدا سے براہ راست کلام کا شرف حاصل رہا؟ اب یہی حضرت موسیٰ، خدا سے سیدھی سادی درخواست نہیں کرتے، کہ جو لوگ توبہ کے لیے آئے ہیں، ان پر رحم فرما، بلکہ یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ اگر تو نے ہلاک کرنا تھا تو پہلے بھی کرسکتا تھا، اب جب یہ توبہ کے لیے آئے ہیں تو ان کو ان احمقوں کی وجہ سے ہلاک نہ کر جنھوں نے شرک کا ارتکاب کیا ہے۔ یعنی خدا کے اس جلال کے موقع پر بھی حضرت موسیٰ کے حواس برقرار رہتے ہیں اور ادب سے، لیکن دلیل کے ساتھ اپنی درخواست پیش کرتے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ کا معاملہ دیکھیے۔ وہ اس جلال میں بھی حضرت موسیٰ پر کسی ناراضی کا اظہار کرنے کے بجاے، ان کی درخواست کو یہاں بھی شرف قبولیت بخشتا ہے اور اس کو قرآن میں نقل کر کے حضرت موسیٰ کے طبعی اور فکری استقلال کی پذیرائی کرتا ہے۔

اب حضرت عمر کا معاملہ دیکھیے، منافقین کے سردار، عبداللہ بن ابی کا جنازہ پڑھانے پر حضرت عمر نے دامن رسول پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنازہ پڑھانے سے روکنا چاہا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رحمت و شفقت کی وجہ سے نماز جنازہ پڑھا دیا، اس پر وحی نازل ہوئی اور آپ کو آیندہ کے لیے منافقین کے لیے نماز جنازہ پڑھانے سے منع فرمایا گیا:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰی قَبۡرِهٖ اِنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَمَاتُوۡا وَهُمۡ فٰسِقُوۡنَ. (التوبہ ۹:۸۴)

’’اور (آیندہ) اُن میں سے جو مر جائے، اُس (کے جنازے) پر کبھی نماز نہ پڑھنا اور نہ اُس کی قبر پر (دعا کے لیے) کھڑے ہونا، اِس لیے کہ اُنھوں نے اللہ اور اُس کے رسول کا انکار کیا ہے اور اِس حال میں مرے ہیں کہ بدعہد تھے۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہاں وحی سے حضرت عمر کی راے کی تائید حاصل ہوگئی، جس پر حضرت عمر خدا کا شکرادا کیا کرتے تھے۔

جب فرعون نے حضرت موسیٰ کی دعوت ایمان اور بنی اسرائیل کی غلامی سے رہائی کے مطالبے پر ان سے کہا کہ تم تو وہ ہو جس کو ہم نے پالا تھا اور تم نے تو ہمارا ایک آدمی بھی قتل کر دیا تھا، تم تو ہمارے مجرم بھی ہو۔ نمک حلالی کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے تمھاری زبان نہ کھلے، اور تم بجاے احسان مند ہونے، اور اپنے جرم کی وجہ سے بجاے ڈرنے اور شرمندہ ہونے کے ہمیں نیا دین سکھانے آ گئے ہو۔ اس پر حضرت موسیٰ کا جواب حریت فکر کا مینارۂ نور ہے، حضرت موسیٰ اور فرعون کا یہ مثالی مکالمہ ملاحظہ کیجیے:

قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّكَ فِيۡنَا وَلِيۡدًا وَّلَبِثۡتَ فِيۡنَا مِنۡ عُمُرِكَ سِنِيۡنَ. وَفَعَلۡتَ فَعۡلَتَكَ الَّتِيۡ فَعَلۡتَ وَاَنۡتَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ. (الشعراء ۲۶: ۱۸-۱۹)

’’اُس نے کہا: کیا ہم نے تمھیں بچپن میں اپنے ہاں رکھ کر پالا نہیں تھا اور (تم وہی نہیں ہو کہ) اپنی عمر کے کئی سال تم نے ہمارے اندر بسر کیے۔ اور پھر اپنی وہ حرکت کی جو کی (اور بھاگ گئے)۔ تم بڑے ہی ناشکرے ہو۔‘‘

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

احسان مندی اور قصورواری، دونوں ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ کسی دوسرے کے لیے حق بات کرنا اور اپنے محسن پر تنقید کرنا تو در کنار، انسان کو اپنی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے۔ اس نازک صورت حال میں حضرت موسیٰ کا جواب غور طلب ہے:

قَالَ فَعَلۡتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيۡنَ. فَفَرَرۡتُ مِنۡكُمۡ لَمَّا خِفۡتُكُمۡ فَوَهَبَ لِيۡ رَبِّيۡ حُكۡمًا وَّجَعَلَنِيۡ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ. وَ تِلۡكَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنۡ عَبَّدۡتَّ بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ.

(الشعراء ۲۶: ۲۰-۲۲)

’’حضرت موسیٰ نے جواب دیا: میں نے یہ اُس وقت کیا تھا اور (مجھے اعتراف ہے کہ) اُس وقت میں چوک گیا تھا۔ پھر مجھے تم لوگوں سے اندیشہ ہوا (کہ اِس کی پاداش میں تم مجھے قتل کر دو گے) تو میں تم سے بھاگ گیا۔ پھر میرے پروردگار نے مجھے حکمت و دانش سے نوازا اور مجھ کو اپنے پیغمبروں میں سے (ایک پیغمبر) بنا دیا۔ اور یہ احسان ہے جو تم مجھے جتا رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے!‘‘

آخری آیت پر غور کیجیے۔ حضرت موسیٰ نے واضح کر دیا کہ کسی کی احسان مندی کے باوجود کسی محسن کو اپنے زیر احسان کے استحصال کا لائیسنس نہیں مل جاتا۔ احسان مندی اور نمک حلالی کے نام پر انسانوں کا استحصال ہمیشہ سے

عام بات رہی ہے۔ حق بات کہنے سے لوگ اس وجہ سے رک جاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بڑوں کا یا اساتذہ کا یا اپنے اداروں کا نمک کھایا ہوا ہے اور ان پر کوئی درست تنقید کرنا یا ان کے کسی منکر پر نکیر کرنا بھی نمک حرامی کے زمرے میں گنا جاتا ہے۔ اور کسی کا قصوروار ہو جانے کے بعد تو جرم کی سزا کے علاوہ بھی قصوروار کے عام حقوق کا استحصال تو بالکل ہی جائز سمجھا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ کا یہ جواب احسان مندوں کو ان کی احسان مندی کے باوجود، اور قصورواروں کو ان کی تقصیرات کے باوجود حریت فکر کے ساتھ حق بات کے لیے کھڑا ہو جانے کا سبق دے رہا ہے۔ خدا کا یہ حکم ایک اور آیت میں اس طرح بیان ہوا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ. (النساء۴: ۱۳۵)

’’ایمان والو، انصاف پر قائم رہو، اللہ کے لیے اُس کی گواہی دیتے ہوئے، اگرچہ یہ گواہی خود تمھاری ذات، تمھارے ماں باپ اور تمھارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔‘‘

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ادھر حضرت عمر کا معاملہ دیکھیے، صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنے جوتے بطور نشانی دے کر اور یہ کہہ کر بھیجا کہ جو شخص ملے، اسے خوش خبری سنا دو کہ جس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا، وہ جنت میں جائے گا۔ حضرت ابوہریرہ جیسے ہی نکلے، پہلی ملاقات حضرت عمر سے ہوگئی۔ حضرت ابوہریرہ نے جب ان کو یہ خوش خبری سنائی تو حضرت عمر نے بجائے کوئی خوشی منانے کے، ان کے سینے پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ وہ بے چارے گر پڑے اور واپس آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شکایت کی۔ حضرت عمر بھی اتنے میں پہنچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ آپ نے عرض کیا کہ لوگوں کو اس طرح خوش خبری سنانا مناسب نہیں۔ لوگ اس بشارت کا غلط فائدہ اٹھا لیں گے اور اس غلط فہمی کے بھروسے پر عمل کرنا ترک کر بیٹھیں گے۔ آپ نے فرمایا: اچھا ٹھیک ہے، رہنے دو، لوگوں کو عمل کرنے دو۔ یہاں بھی دیکھیے کہ حضرت عمر کی رائے کو بارگاہ نبوت سے تائید حاصل ہوئی۔ فہم دین اور مزاج نبوت کا کتنا درست اندازہ تھا حضرت عمر کو! حضرت عمر کی حریت فکر کا یہ مظاہرہ غیر معمولی نوعیت کا حامل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کی رائے کو قبول کر لینا اہل اختیار کے لیے ایک مثالی نمونہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات میں ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاغذ و قلم طلب فرمایا کہ میں تمھیں کچھ ایسا لکھ کر دے جاؤں کہ میرے بعد تم گم راہ نہ ہو گے۔ اس موقع پر حضرت عمر نے نہایت جرأت مندانہ

رائے دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت، کامل طریقے سے قرآن کی صورت میں پہنچا دی ہے تو مزید کسی چیز کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت اچھی نہیں، اس حالت میں آپ کا کچھ لکھوانا شاید مناسب نہ ہو، مبادا کوئی غلطی ہو جائے۔ ہماری ہدایت کے لیے قرآن کافی ہے۔ اس پر صحابہ کے درمیان بحث ہوگئی، کچھ نے حضرت عمر کی مخالفت کی اور کچھ نے ان کی تائید کی۔ آوازیں بلند ہوئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نا گوار گزرا اور آپ نے سب کو باہر چلے جانے کا کہہ دیا۔ اس واقعہ کے بعد بھی رسول اللہ کئی دن حیات رہے، لیکن آپ نے ایسا کچھ نہ لکھوایا جس کا عندیہ آپ نے پہلے دیا تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی وقتی کیفیت تھی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لکھوانا چاہا، مگر جب آپ کی طبیعت بحال ہوگئی تو آپ نے بھی ایسی کوئی بات بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ ایک رسول کی حیثیت سے آپ کی ذمہ داری تھی کہ آپ ہر وہ بات امت کو پہنچا کر دنیا سے رخصت ہوں جو ان کی رسالت کا تقاضا اور امت کی ہدایت کے لیے ضروری تھی۔ یہ چیز قرآن میں واضح طور پر بتائی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ. (المائدہ ۵:۶۷)

”اے پیغمبر، (اور) جو کچھ تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ (اِنھیں) پہنچا دو اور (یاد رکھو کہ) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اُس کا پیغام نہیں پہنچایا۔ اللہ اِن لوگوں سے تمھاری حفاظت کرے گا۔ (تم مطمئن رہو)، اللہ (تمھارے مقابلے میں تمھارے) اِن منکروں کو ہرگز کامیابی کا راستہ نہ دکھائے گا۔“

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت کی ہدایت کے لیے کوئی ضروری بات بتانے سے محض اس وجہ سے رک گئے کہ کچھ صحابہ نے اس وقت لکھوانا مناسب نہ جانا تھا۔ ممکن ہے وہ ایسی ہی کوئی بات ہوتی جس میں قرآن و سنت کو مضبوطی سے پکڑے رکھنے کی نصیحت ہوتی۔ بہر حال، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بعد کا طرز عمل بتاتا ہے کہ حضرت عمر کی حریت فکر نے یہاں بھی درست طرزِ عمل اختیار کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ کوئی نئی بات نہیں لکھوائی۔

یہی حریت فکر تھی جس کی وجہ سے حضرت عمر سے دین کے معاملات میں اجتہادات کا سب سے زیادہ ظہور ہوا۔ آپ کے اجتہادات کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ کئی مواقع پر آپ کی رائے کی تائید میں وحی نازل ہوتی رہی۔ مذکورہ بالا امثال کے علاوہ، ایک اور موقع پر جب منافقین کی اہل بیت نبی میں

سکینڈل بنانے کی مہم عروج پر تھی تو اس کے سد باب کے لیے ازواجِ نبی کے لیے پردے کا خصوصی اہتمام حضرت عمر کی خواہش تھی۔ وحی کے ذریعے سے یہ خصوصی احکامات سورۂ احزاب میں نازل ہوئے۔ حضرت عمر کے اجتہادات نے پوری امتِ مسلمہ کا علمی رجحان متعین کیا۔ ان کے اجتہادات پر مستقل تصانیف موجود ہیں۔

حریت فکر کا ایک لازمی اظہار مظلوم کی حمایت ہے۔ ایک آزاد ذہن جو اپنا استحصال برداشت نہیں کرتا، وہ دوسروں کے استحصال پر بھی خاموش نہیں رہ پاتا۔ یہ وہ غیرت ہے جو انسانیت کا حسن ہے۔ اسی غیرت کی بنا پر حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے اس قبطی کا قتل بھی ہو گیا تھا جو ان کی قوم کے ایک فرد سے جھگڑ رہا تھا۔ چونکہ قبطی کا ظالم ہونا ہی زیادہ قرین قیاس تھا، اس لیے اس قضیے میں آپ کو یہی گمان ہوا ہوگا کہ زیادتی قبطی کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبطی بھی جھگڑا چھوڑنے پر تیار نہ ہوا تو آپ نے اسے گھونسا مارا جو ایسا بے ڈھب پڑا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ تاہم، بعد میں آپ کو اندازہ ہو گیا کہ جھگڑالو اسرائیلی تھا، کیونکہ اگلے دن وہ پھر کسی سے جھگڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود آپ وہ جھگڑا بھی ختم کرنے کے لیے آگے بڑھے تھے۔ مظلوم کی حمایت کا دوسرا واقعہ تب پیش آیا جب حضرت موسیٰ مدین پہنچے تو انھوں نے دو خواتین کو دیکھا کہ ایک کنویں کے پاس اپنی بکریاں پانی سے روکے کھڑی ہیں، جب کہ کنویں پر دوسرے لوگ اپنے اپنے جانوروں کو پانی پلانے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے پاس گئے اور ان کی مجبوری دریافت کی۔ لڑکیوں نے بتایا کہ علاقے کے لوگ ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتے۔ یہ جب چلے جائیں گے تو وہ اپنی بکریوں کو پانی پلا پائیں گی، ان کے والد عمر رسیدہ اور ضعیف تھے اور یہ کام انھیں ہی کرنا پڑتا تھا۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ نے آگے بڑھ کر ان کی بکریوں کو پانی پلوا دیا۔

مظلوم کی حمایت کے اسی مزاج کا اثر حضرت عمر کے ہاں متعدد واقعات میں ملتا ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے مظلوم کو انصاف کی فراہمی ویسے بھی آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عدل عمر ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا۔ یہ طے تھا کہ چاہے کوئی کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، کسی پر ظلم کرنے کے بعد وہ ان کے انصاف سے بچ نہیں سکتا تھا۔ اس سلسلے میں بہت سے واقعات کتب تاریخ میں مرقوم ہیں۔ مثلاً غسان کا بادشاہ جبلۃ الایھم مسلمان ہو کر مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ حضرت عمر خوش ہوئے کہ ایک طاقت ور شخص اسلام کا حصہ بن گیا اور اس کی طاقت اسلام کی خدمت میں استعمال ہو سکے گی۔ پھر اسے مکہ بھیجا گیا، جہاں خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے اُس کے تہ بند کے کنارے پر ایک دیہاتی کا پاؤں آ گیا۔ بادشاہ نے غصے میں آ کر اُس کے منہ پر تھپڑ دے مارا، جس سے اس کی ناک اور سامنے کے دانت بھی ٹوٹ گئے۔ دیہاتی فریاد لے کر مدینہ میں حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے

شاہ غسان کو طلب فرمایا، اس نے اعتراف کیا، بلکہ یہ بھی کہا کہ حرم نہ ہوتا تو میں اسے اس حرکت پر قتل کر دیتا۔ حضرت عمر نے فیصلہ دیا کہ بادشاہ اس دیہاتی کو راضی کرے یا قصاص میں منہ پر تھپڑ کھائے۔ بادشاہ نے حیران ہو کر پوچھا کہ آپ کے ہاں شاہ و گدا میں کچھ فرق نہیں ہے کیا؟ آپ نے فرمایا: بالکل نہیں، اسلام نے دونوں کا مرتبہ ایک جیسا کر دیا ہے۔ یہ سن کر اس نے رات کی مہلت مانگی۔ دیہاتی سے پوچھا گیا کہ کیا وہ بادشاہ کو ایک رات کی مہلت دینے پر راضی ہے، اس نے رضامندی دے دی۔ بادشاہ رات کے اندھیرے میں ہی مدینہ منورہ سے بھاگ کر ملک شام کی طرف چلا گیا اور مرتد ہو گیا۔ ایک شخص کا اسلام سے نکل جانا گوارا کر لیا گیا، مگر انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا۔

عقل کے استعمال اور اپنی راے رکھنے کے معاملے میں حضرت موسیٰ اور حضرت عمر، دونوں سے غلطی بھی ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے خدا کو دیکھنے کی فرمایش کر ڈالی اور حضرت عمر حدیبیہ کا معاہدہ کرنے پر اعتراض کر بیٹھے۔ دونوں اپنی جرأت پر نادم ہوئے۔ خطا کا امکان، عقل کے استعمال کا لازمہ ہے۔ انسان کو خدا نے اس سے مبرا نہیں کیا۔ اسی خطا کوشی کے ساتھ خدا نے عقل و راے کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ انسان کی آزمایش ہی یہی ہے۔ وہ پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اپنے عقل و فہم کے مطابق دیانت سے جو سمجھے اس پر عمل کرے، خطا کرے، لیکن درست بات سامنے آنے پر اَنا اور تسلیم حق کی آزمایش میں حق کو تسلیم کر کے کامیابی کا راستہ اختیار کرے۔ اندھی تقلید نہیں، بلکہ عقل کی راہ سے عمل کرنا ہی خدا کا مطلوب ہے اور اس میں خطا کو گوارا کیا گیا ہے۔

ایک طرف خدا اور رسول ہیں جن کے سامنے حضرت موسیٰ اور حضرت عمر کی حریت فکر کے یہ مظاہرے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ہمارے رویے دیکھیے کہ دینی پیشوا ہوں یا سیاسی رہنما، خاندان کے بزرگ ہوں یا کسی محکمے کے سربراہ، ان کی اندھی تقلید اور غلامانہ فرماں برداری کو مطلوب سمجھا جاتا ہے۔ رہنمائی کے منصب پر بیٹھے افراد بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ان کے پیروکاران کے ایک اشارے پر بلا سوچے سمجھے اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں، بلکہ حقیقتاً ان کی جانیں بے دریغ لٹائی بھی جاتی ہیں۔ اپنے رہنماؤں پر تنقید تو دور کی بات ہے، ان کے سامنے سوال کرنا ہی گستاخی کے زمرے میں آتا ہے۔ محکمے کے سربراہ گوارا نہیں کرتے کہ ان کے ماتحت کی کوئی راے ان کی راے سے مختلف ہو، خاندان کے بزرگ اس پر زور دیتے ہیں کہ ان کے غلط کو بھی درست کہنا اصل فرماں برداری ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کی تذلیل ہے کہ اس کی اپنی کوئی راے نہ ہو۔ جس بات کو وہ درست سمجھتا ہو، اس کے اظہار پر پابندی ناروا جبر ہے۔ ایک طرف خدا اور رسول ہیں جو اپنے بندوں اور پیروکاروں کی راے بھی قبول کرتے ہیں، اور دوسری طرف انسان ہیں جو اپنے جیسے انسانوں کی راے کو اپنی راے سے مختلف پا کر اسے بغاوت اور مخالفت سمجھ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

لیتے ہیں۔

دین میں عقل کے استعمال اور جرأت اظہار کی جو نازک راہ حضرت موسیٰ اور حضرت عمر کے ذریعے سے کھلتی ہے، اس نے ہمارے لیے دین کے احکام میں سوچ سمجھ کر عمل کرنے کا مطلوبہ نمونہ پیش کیا ہے۔ اگر خدا اور رسول کی بارگاہ میں حریت فکر کی پذیرائی کا یہ عالم ہے تو دنیاوی معاملات میں تو اس کو بدرجۂ اولیٰ گنجایش دینا ضروری ہے کہ یہاں ایسی کوئی اتھارٹی نہیں ہو سکتی جس کا علم خدا کے علم کی طرح کامل اور ہدایت رسول کی ہدایت کی طرح قطعی ہو۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

"...روزہ اللہ کے لیے ہے اور وہی اُس کی جزا دے گا۔ یعنی بندے نے جب بغیر کسی سبب کے محض اللہ کے حکم کی تعمیل میں بعض جائز چیزیں بھی اپنے لیے ممنوع قرار دے لی ہیں تو اب وہ ناپ تول کر اور کسی حساب سے نہیں، بلکہ خاص اپنے کرم اور اپنی عنایت سے اُس کا اجر دے گا اور اِس طرح بے حساب دے گا کہ وہ نہال ہو جائے گا۔" (میزان، جاوید احمد غامدی ۳۵۷)

ڈاکٹر عرفان شہزاد

مطلقہ اور بیوہ کی عدت: ایک جائزہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قرآن مجید میں طلاق یا شوہر کی وفات کے بعد خواتین کو عدت پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عدت کا اصل مقصد قطعی طور پر یہ معلوم کرنا ہے کہ خاتون حمل سے ہے یا نہیں۔ طلاق کے بعد اگر وہ فوراً دوسری شادی کر لے تو بچے کا نسب مشتبہ ہو جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ جس خاتون کو محض نکاح کے بعد طلاق دے دی جائے اور تعلق زن و شو قائم نہ ہوا ہو، اس پر شریعت نے کوئی عدت مقرر نہیں کی:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَکَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْھُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْھُنَّ فَمَا لَکُمْ عَلَیْھِنَّ مِنْ عِدَّۃٍ تَعْتَدُّوْنَھَا فَمَتِّعُوْھُنَّ وَسَرِّحُوْھُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا. (الاحزاب ۳۳: ۴۹)

”ایمان والو، (اِس لیے کہ) جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرتے ہو، پھر ہاتھ لگانے سے پہلے اُن کو طلاق دے دیتے ہو تو اُن پر تمھاری خاطر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کا تم شمار کرو گے۔ لیکن (اِس صورت میں بھی ضروری ہے کہ) اُنھیں کچھ سامان زندگی دو اور اُن کو بھلے طریقے سے رخصت کرو۔“

اسی بنا پر حاملہ عورت کی عدت وضع حمل مقرر کی گئی ہے، بچے کی ولادت اگر طلاق ملنے یا شوہر کی وفات کے دن ہی ہو جائے تو عورت پر عدت نہیں رہتی۔ شریعت نے یہ چند صورتیں ہمارے سامنے رکھ دی ہیں جن میں امکانِ حمل جب نہیں پایا گیا تو عدت بھی مقرر نہیں کی گئی، اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر مزید ایسی قطعی صورتیں ہمارے سامنے آ جاتی ہیں جن میں حمل کا امکان نہ پایا جائے تو وہاں بھی عدت لاگو نہیں ہو گی۔ مثلاً قطعی طور پر بانجھ خاتون، ایسی عمر رسیدہ کہ حمل کا امکان مفقود ہو، ایسی بیوہ جس کا خاوند سے تعلق زن و شو قائم نہ رہا ہو، نیز میڈیکل

رپورٹ سے بھی اگر قطعی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ عورت کو حمل نہیں ہے تو عدت پوری کرنے کی ضرورت لازمی طور پر نہیں ہوگی، یہ اس لیے کہ حمل کی حالت معلوم کرنے کا جو مقصد پیش نظر تھا، وہ حاصل ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں طلاق دینے والے مرد کو اپنی مطلقہ عورت سے رجوع کرنے کا حق بھی نہیں ہوگا، تاہم وہ اس سے نکاح ثانی کر سکتا ہے، اگر یہ تیسری دفعہ کی طلاق نہ ہو۔

یہاں چند سوالات یا اعتراضات پیدا ہوتے ہیں:

پہلا یہ کہ استقرار حمل کا امکان تو ایک حیض ہی سے ختم ہو جاتا ہے، عورت کو حمل ٹھیر جاتا ہے تو حیض آنا بند ہو جاتا ہے، تو پھر شریعت میں تین حیض کی مدت کیوں مقرر کی گئی ہے؟ اگر عورت کی عدت کی حکمت صرف یہ معلوم کرنا ہو کہ سابقہ خاوند سے اس کو حمل ہے یا نہیں، تو یہ مدت محض ایک حیض ہونی چاہیے تھی، لیکن شریعت نے طلاق یافتہ عورت کی عدت تین حیض، بیوہ کی چار ماہ دس دن اور غیر حائضہ کی تین ماہ مقرر کی ہے۔ اب چار ماہ دس دن اور تین ماہ تو بالکل واضح ہے کہ اس گنتی کا حمل کی حالت معلوم کرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پس عدت میں اصل حکمت نہیں، اللہ کا حکم ہے کہ جس پر ہر صورت اور ہر حال میں عمل ہوگا۔

دوسرا سوال یہ ہوسکتا ہے کہ میڈیکل سائنس کے مطابق مرد کا سپرم عورت کے رحم میں پانچ دن سے زیادہ زندہ نہیں رہتا، تو پھر عدت کے لیے تین حیض یا چار ماہ دس دن تک انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ عدت کے دوران مرد کا حق رجوع اوپر ہماری بیان کردہ تعبیر کی صورت میں ختم ہو جاتا ہے، جس سے شریعت کا ایک منشا فوت ہو جاتا ہے۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ ایک حیض سے ہمیشہ قطعی طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ حمل ہے یا نہیں۔ طبی سائنس کے اعداد و شمار سے یہ واضح ہے کہ حمل کے پہلے تین ماہ (First Trimester) میں حیض نما خون آنا ۲۰ سے ۳۰ فی صد خواتین میں عام پایا گیا ہے، اور اس کی متعدد وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ خصوصاً اگر حیض کے قریب مباشرت سے حمل ٹھیرا ہوا تو حیض کا خون بیش تر کیسز میں آتا ہے۔ اس لیے ایک حیض سے بغیر سائنسی ذرائع کے قطعی طور پر حمل کا نہ ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے شریعت نے حمل کی حالت قطعی طور پر معلوم کرنے کے لیے عدت مقرر کی۔ دوسرے سوال کا جواب بھی اسی میں مضمر ہے کہ جدید سائنسی ذرائع کی عدم موجودگی میں حمل ٹھیرنے یا ٹھیرنے کے امکان کے واضح ہونے کے لیے عدت کا وقت گزارنا ضروری تھا۔

مطلقہ، بیوہ اور غیر حائضہ کی عدت کی بظاہر مختلف مدتوں کے پیچھے دراصل ایک ہی اصول کارفرما ہے جس کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وضاحت ذیل میں کی جاتی ہے:

شریعت کا منشا یہ ہے کہ عدت کی گنتی میں کوئی ابہام نہیں رہنا چاہیے:

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّۃَ. (الطلاق ۶۵:۱)

''اے نبی، تم لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دو تو اُن کی عدت کے حساب سے طلاق دو، اور عدت کا زمانہ ٹھیک ٹھیک شمار کرو۔''

اس لیے مرد کو یہ حکم ہے کہ وہ ایک ایسے طہر میں بیوی کو طلاق دے جس میں تعلق زن وشو نہ قائم ہوا ہو۔ اس کے بعد تین حیض سے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ خاتون حمل سے نہیں۔ شوہر کی وفات کی صورت میں چونکہ شوہر پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی تھی کہ وہ ایسے طہر میں فوت ہو جس میں زن وشو کا تعلق قائم نہ کیا گیا ہو، اس لیے بیوہ کی عدت بڑھا کر چار ماہ دس دن کر دی گئی تا کہ تین حیض سے قبل تعلق قائم ہوا بھی ہو، تب بھی مزید ایک ماہ دس دن سے معاملہ قطعی طور پر واضح ہو جائے۔

غور کیجیے تو حمل کا حال معلوم کرنے کی یہ مدت، طلاق اور بیوگی، دونوں کی عدتوں میں عملاً چار ماہ سے زائد بنائی گئی ہے۔ وہ اس طرح کہ شرعی طریقہ سے طلاق دی گئی ہو تو ایسے طہر میں طلاق دی جانی چاہیے جس میں مباشرت نہ کی گئی ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس طہر سے پہلے حیض اور اس سے پہلے طہر میں مباشرت سے اگر حمل ٹھیرا ہو تو وہ طہر جس میں طلاق دی گئی اور اس سے اگلے تین حیض تک یہ مدت حمل کے لیے چار ماہ سے کچھ دن زیادہ بنتی ہے، یعنی تقریباً اتنی ہی جتنی بیوہ کی عدت ہے۔ بغیر کسی سائنسی ذریعہ کے حمل کی حالت معلوم کرنے کے لیے یہ کم سے کم قطعی مدت ہے۔ چار ماہ کا حمل نہ صرف نظر سے معلوم ہو جاتا ہے، بلکہ بچے کی حرکت بھی چوتھے ماہ سے شروع ہوتی ہے۔ گویا حمل کے معاملے میں کوئی ابہام نہیں رہتا۔ اگر حمل چھپانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہو تو وہ بھی اتنی مدت میں ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ چنانچہ دیکھا جائے تو مطلقہ اور بیوہ، دونوں کے حمل کی حالت معلوم کرنے کے لیے تقریباً ایک جتنی مدت مقرر کی گئی ہے۔

اگلی بات یہ ہے کہ جس طرح حائضہ کی عدت تین حیض مقرر کرنے میں یہ بات مضمر ہے کہ عدت کی مدت میں کسی ابہام سے بچنے کے لیے اسے ایسے طہر میں طلاق دی جانی چاہیے جس میں تعلق زن وشو قائم نہ کیا گیا ہو، اسی طرح غیر حائضہ کے معاملے میں بھی مرد پر یہی پابندی لگائی جائے گی کہ ایسی خاتون کو طلاق دینے سے پہلے ایک ماہ تک تعلق زن وشو قائم نہ کیا گیا ہو۔ اس کی خلاف ورزی کرنے پر وہی کارروائی کی جا سکتی ہے جو مطلقہ حائضہ کے معاملے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں کی جا سکتی ہے۔ اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو رہنمائی ہم تک پہنچی ہے، وہ یہ ہے کہ عدالت ایسے فیصلے کو کالعدم قرار دے کر مرد کو رجوع کا حکم دے سکتی ہے اور اگر حالات کا تقاضا ہو تو ایسی طلاق کو نافذ بھی کر سکتی ہے، تاہم اس پر نکیر کی جائے گی۔

تیسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ عدت کی مدت کے دوران مرد کے لیے رجوع کا حق اس مہلت کا ایک اضافی یا ضمنی فائدہ ہے۔ یہ ضمنی فائدہ اگر اصل ہوتا یا ایسا موثر ہوتا کہ عدت کو ہر حال میں برقرار رکھ سکتا تو مطلقہ غیر مدخولہ (جسے نکاح کے بعد صحبت سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو) کے معاملے میں بھی اس کی پابندی ہونی چاہیے تھی کہ یہاں تعلق حقیقتاً شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا، اور رجوع کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ ممکن ہے کہ تعلق اگر ایک بار شروع کرا دیا جاتا تو نباہ کی صورت بن جاتی، اور مرد اور خاتون اور ان کے خاندان اس قبل از وقت قطعِ تعلق کی تکلیف سے بچ پاتے۔ نیز یہی عدت وضع حمل کے بعد بھی ہونی چاہیے تھی کہ دنیا میں آنے والا بچہ باپ کی شفقت سے محروم نہ رہے، چنانچہ ایک طلاق یافتہ خاتون طلاق ملنے کے فوراً بعد اگر حمل سے فراغت پا جاتی ہے تو اس پر کوئی عدت نہیں رہتی۔

ایسی صورت میں مرد و عورت اگر دوبارہ ساتھ رہنا چاہیں تو نکاح ثانی کا دروازہ، البتہ کھلا ہوا ہے۔

ہمارے معروضی سماجی حالات میں عدت کے یہ پہلو لوگوں پر چونکہ واضح نہیں، اس لیے نزاعات سے بچنے کے لیے مجاز اتھارٹیز کو فریقین کی رضامندی اور اعتماد سے کوئی فیصلہ لینا چاہیے۔

www.javedahmedghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد تہامی بشر علوی

قبیلائی تعصّبات: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

انسانوں کا خالق جانتا تھا کہ انسان میں کوکوئی مقام حاصل ہو گیا تو یہ پھولے نہ سمائے گا۔ خدشہ تھا یہ اپنے غرور کی چیزوں میں اپنے قبیلوں کو بھی شامل کر گزریں گے۔ پروردگار نے اس بد خصلتی سے متنبہ کر دیا کہ کہیں انسانوں کو ان کی جہالت لے نہ ڈوبے اور وہ قبیلائی فخر و تعصب میں مبتلا ہو کر خدا کے عتاب و سزا کے مستحق جا ٹھیریں۔ قرآن مجید بتاتا ہے:

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡئًا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَ الۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَارِ الۡجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالۡجَـنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ وَمَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا. (النساء ۴: ۳۶)

”اور تم سب اللہ کی بندگی کرو اور اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھیراؤ، والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور رشتہ دار پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں اور ہم نشینوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آؤ۔ (اِسی طرح) مسافروں اور لونڈی غلاموں کے ساتھ جو تمھارے قبضے میں ہوں۔ اللہ اُن لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اتراتے اور اپنی بڑائی پر فخر کرتے ہیں۔“

دوسرے موقع پر یوں ہدایت دی گئی:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ وَ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (الحجرات ۴۹:۱۱)

''ایمان والو، (اِسی اخوت کا تقاضا ہے کہ) نہ (تمھارے) مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔ اور نہ اپنوں کو عیب لگاؤ اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو برے القاب دو۔ (یہ سب فسق کی باتیں ہیں، اور) ایمان کے بعد تو فسق کا نام بھی بہت برا ہے۔ اور جو (اس تنبیہ کے بعد بھی) توبہ نہ کریں تو وہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں[۱]۔''

مولانا مودودی آیت کے ان الفاظ کی توضیح میں لکھتے ہیں:

''مذاق اڑانے سے مراد محض زبان ہی سے کسی کا مذاق اڑانا نہیں ہے، بلکہ کسی کی نقل اتارنا، اس کی طرف اشارے کرنا، اس کی بات پر یا اس کے کام یا اس کی صورت یا اس کے لباس پر ہنسنا، یا اس کے کسی نقص یا عیب کی طرف لوگوں کو اس طرح توجہ دلانا کہ دوسرے اس پر ہنسیں، یہ سب بھی مذاق اڑانے میں داخل ہیں۔ اصل ممانعت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی کسی نہ کسی طور پر تضحیک کرے، کیونکہ اس تضحیک میں لازماً اپنی بڑائی اور دوسرے کی تذلیل وتحقیر کے جذبات کارفرما ہوتے ہیں جو اخلاقاً سخت معیوب ہیں، اور مزید برآں اس سے دوسرے شخص کی دل آزاری بھی ہوتی ہے جس سے معاشرے میں فساد رونما ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس فعل کو حرام کیا گیا ہے۔''

''اس حکم کا منشا یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسے نام سے نہ پکارا جائے یا ایسا لقب نہ دیا جائے جو اس کو ناگوار ہو اور جس سے اس کی تحقیر وتنقیص ہوتی ہو۔ مثلاً کسی کو فاسق یا منافق کہنا۔ کسی کو لنگڑا یا اندھا یا کانا کہنا۔ کسی کو اس کے اپنے یا اس کی ماں یا باپ یا خاندان کے کسی عیب یا نقص سے ملقّب کرنا۔ کسی کو مسلمان ہو جانے کے بعد اس کے سابق مذہب کی بنا پر یہودی یا نصرانی کہنا۔ کسی شخص یا خاندان یا برادری یا گروہ کا ایسا نام رکھ دینا جو اس کی مذمت اور تذلیل کا پہلو رکھتا ہو[۲]۔''

انسانوں کو لاحق ہو سکنے والی یہ جہالت سنگین تھی، سو یہاں بہ اندازِ دگر یوں تلقین کی گئی:

۱۔ البیان، جاوید احمد غامدی۔

۲۔ تفہیم القرآن، آیت کا ذیلی حاشیہ۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ. (الحجرات ۴۹:۱۳)

''اے لوگو، حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمھیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو۔ یقین رکھو کہ اللہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز سے باخبر ہے۔[۳]''

اس آیت کی توضیح میں جاوید احمد غامدی لکھتے ہیں:

''قرآن نے اُس نسلی، خاندانی اور قبائلی غرور کی بنیاد ڈھا دی ہے جو اُن برائیوں میں سے زیادہ تر کا باعث بنتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ فرمایا کہ تمام انسان آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ کسی گورے کو کالے اور کسی کالے کو گورے پر، کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عز و شرف کی بنیاد کسی شخص کے خاندان اور قبیلہ یا رنگ و نسل پر نہیں، بلکہ تقویٰ پر ہے۔ اُس کے ہاں وہی عزت پائے گا جو سب سے بڑھ کر اُس سے ڈرنے والا اور اُس کے حدود کی پابندی کرنے والا ہے، اگرچہ کتنے ہی حقیر اور گم نام خاندان سے اٹھا ہو۔ اور جو سرکشی اور استکبار اختیار کرے گا، وہ لازماً ذلت سے دوچار ہو گا، اگرچہ کتنا ہی بڑا قریشی اور ہاشمی ہو۔ خاندانوں کی یہ تقسیم محض تعارف اور پہچان کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح لوگوں کے چہرے مہرے، رنگ اور قد و قامت میں فرق رکھا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں، اُسی طرح خاندانوں کی تقسیم بھی اِسی مقصد سے کی ہے۔ اِس سے زیادہ اِن کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔[۴]''

اس آیت میں پروردگار نے انسانوں پر واضح کر دیا کہ تمھارے نسلی و قبیلائی بتوں کی خدا کے ہاں کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔ تم سب خدا کے بندے ہو اور تم سب کو آدم و حوا سے ہی پیدا کیا گیا ہے۔

آیت کے نزول کا پس منظر:

روایات میں بیان ہوا ہے کہ یہ آیت قبیلائی تعصّبات کی باتیں چلنے کے موقع پر نازل ہوئی۔ عرب کے بنو بیاضہ

[۳] آسان ترجمۂ قرآن، مفتی محمد تقی عثمانی۔

[۴] البیان، جاوید احمد غامدی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قبیلے والوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلے سے باہر شادی دینے کا مشورہ دیا، جس پر انھوں نے قبیلائی تعصب پر مبنی جملہ کہا، خدا نے انسانوں کو متنبہ کیا کہ خبردار! تم سب آدم کی اولاد ہو۔

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو بیاضہ قبیلہ والوں سے کہا کہ تم اپنے قبیلہ کی کسی لڑکی سے ابو ہند صحابی کا نکاح کر دو تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی لڑکیوں کا نکاح اپنے غلاموں سے کر دیں۔ یعنی غلاموں سے نکاح کرنے کو انھوں نے اپنے لیے عار سمجھا۔ اس واقعہ کی وجہ سے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ خاص طور سے یہ آیت ابو ہند رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابو ہند رضی اللہ عنہ پیشہ کے اعتبار سے حجام تھے۔[۵]

مومنین کرام کو یہ بات نوٹ کرنی ہوگی کہ اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حجام صحابی کا نکاح بنو بیاضہ قبیلے میں کرنے کی بات کی۔ قبیلہ والوں کے جواب پر خدا نے کیا رہنمائی دی۔ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لینے پر سب واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے سوسائٹی میں حجام کو کیا مقام حاصل ہے۔ اور یہ کہ قبیلے سے باہر شادی کے معاملے میں ہم کہاں تک خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کر رہے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسی آیت کے پس منظر کے حوالے سے ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے، ابن عباس فرماتے ہیں کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کچھ اونچا سنتے تھے صحابۂ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں سبقت کرنے کے باوجود ان کے لیے جگہ دے دیا کرتے تھے تو یہ ثابت رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو کے قریب بیٹھ جاتے تھے تاکہ فرامین نبوی کو سن سکیں۔ ایک دن یہ آئے تو ایک رکعت فجر کی ان سے فوت ہوگئی، نماز سے فارغ ہو کر تمام صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب اپنی اپنی نشست پکڑ لی اور صحابۂ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اس طرح بیٹھا کرتے تھے کہ درمیان میں کسی کے بیٹھنے کی گنجایش نہ رہتی تھی۔ ثابت بن قیس نماز سے فارغ ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے لوگوں کی گردن پھلانگتے ہوئے اور جگہ دو جگہ دو کہتے ہوئے، صحابہ نے ان کے لیے گنجایش دی اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گئے، مگر ان کے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک اور صحابی تھے، ان آگے کے صحابی سے ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جگہ دو، آگے والے صحابی نے جواب دیا: میں اپنی جگہ بیٹھا ہوں، تم اپنی جگہ بیٹھو، ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ غصہ کی حالت میں ان کے پیچھے بیٹھے اور کسی سے پوچھا: یہ کون ہے؟ جواب ملا کہ فلاں ہے، ثابت رضی اللہ عنہ نے ان

۵ مراسیل ابوداؤد/۱۲۔ الجامع لاحکام القرآن، قرطبی ۶۰۴/۸۔ الصاوی ۱۴۶/۴۔

آ گے والے صحابی کو 'یا بن فلانة' کہا، جس سے زمانۂ جاہلیت کی کوئی عار دلانی مقصود تھی، وہ آ گے والے صحابی بہت شرمندہ ہوئے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'یا بن فلانة' کہنے والا کون ہے؟ ثابت رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں یارسول اللہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان سب کے چہروں کو دیکھو ثابت رضی اللہ عنہ نے موجود تمام صحابہ کے چہروں کو دیکھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثابت، کیا دیکھا؟ عرض کیا: کوئی سفید ہے؛ کوئی سرخ ہے؛ کوئی سیاہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیکھو، تم ان سے نہیں بڑھ سکتے، مگر تقویٰ کی وجہ سے، یعنی تمھارا تقویٰ اور پرہیز گاری ان سے بڑھ کر ہے تو تمھارا مقام عنداللہ اونچا ہوگا، یہ دنیوی اونچ نیچ کی وقعت عنداللہ نہیں ہے۔[6]

اور ایک قول یہ ہے کہ فتح مکہ کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان پڑھنے کا حکم دیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی تو کفار مکہ میں سے عتاب بن اسید بن ابی العاص نے کہا: اللہ کا شکر ہے جس نے میرے والد کو یہ برا دن دیکھنے سے قبل ہی اٹھا لیا۔ حارث بن ہشام نے کہا: اس کالے کوے کے سوا محمد کو کوئی مؤذن ہی نہ ملا۔ سہیل بن عمرو نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو اس کو بدل دیں۔ ابوسفیان جو ابھی اسلام قبول نہیں کیے تھے، انھوں نے کہا: میں کچھ نہیں کہتا، مجھے خوف ہے کہ اس کی خبر آسمان کا رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دے۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور کفار مکہ کی یہ شرارت انگیز خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلایا اوران سے پوچھا: کیا یہ باتیں تم سب نے کہی ہیں؟ ان سب نے اقرار کیا۔[7]

ابونضرة کہتے ہیں کہ مجھ سے اس شخص نے بیان کیا جو مقام منیٰ میں ایام تشریق کے درمیان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبوں میں حاضر تھا، دراں حالیکہ آپ اونٹ پر سوار تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لوگو، خبردار، تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ (آدم) ایک ہے؛ خبردار، کسی عربی آدمی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر؛ نہ کسی کالے وسیاہ آدمی کو کسی سرخ پر اور نہ کسی سرخ کو کسی سیاہ آدمی پر کوئی فضیلت ہے۔ ہاں، تقویٰ فضیلت کا مدار ہے، پھر آپ نے صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: کیا میں نے پیغام الٰہی امت تک پہنچا دیا؟ صحابہ نے جواب دیا: جی ہاں، آپ نے پہنچا دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو یہاں موجود ہے، وہ اس تک پہنچا دے جو

۶۔ الجامع لاحکام القرآن، قرطبی ۵۹۲/۸۔ الصاوی ۱۴۶/۴۔

۷۔ تفسیر قرطبی ۶۰۵/۸۔ الصاوی ۱۶۴/۴۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

موجود نہیں ہے:

عن أبي نضرة، قال: حدثني أو حدثنا من شهد خطب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم بمنٰی في وسط أیام التشریق وهو علی بعیر، فقال: "یا أیها الناس، ألا إن ربکم واحد وإن أباکم واحد، ألا لا فضل لعربي علی عجمي ولا عجمي علی عربي ولا لأسود علی أحمر ولا لأحمر علی أسود إلا بالتقوٰی، ألا هل بلغت"؟ قالوا: نعم، قال: "لیبلغ الشاهد الغائب[8]".

تفسیر قرطبی میں بحوالہ طبری حضرت مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمھارے حسب ونسب کو نہیں دیکھتے اور نہ تمھارے جسموں ومالوں کو دیکھتے ہیں، لیکن تمھارے دلوں (کے حال) کو دیکھتے ہیں۔ پس جس کا دل صالح ونیک ہو، اللہ تعالیٰ اس پر مہربان ہوتے ہیں اور بلاشبہ تم سب آدم کی اولاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب تم میں وہ ہے جو بڑا متقی ہے[9]۔''

عن ابن مسعود عن النبي صلی اللّٰہ علیه وسلم، قَالَ: "مَنْ نَصَرَ قَوْمَه عَلٰی غَیْرِ الْحَقِّ کَالْبَعِیْرِ الَّذِيْ رَدٰی فَهُوَ یُنْزَعُ بِذَنَبِه".

''ابن مسعود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو شخص اپنی قوم کی ناحق مدد کرتا ہے، وہ اس اونٹ کے مانند ہے جو کنویں میں گر گیا اور اس کی دم پکڑ کر اس کو نکالا جائے[10]۔''

عن جبیر بن مطعم أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قَالَ: "لَیْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا اِلٰی عَصَبِیَّةٍ وَلَیْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَصَبِیَّةً وَلَیْسَ مِنَّا مَنْ مَّاتَ عَلٰی عَصَبِیَّةٍ".

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم میں سے نہیں جس نے عصبیت کی دعوت دی اور ہم میں سے نہیں جس نے عصبیت کی خاطر قتال کیا اور ہم میں سے نہیں وہ جو عصبیت کی حالت میں مر گیا[11]۔''

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۸؎ روح المعانی ۸/ ۱۶۴ من روایت البیہقی والمردویہ، تفسیر قرطبی ۸/ ۲۰۵۔

۹؎ قرطبی ۸/ ۲۰۵ کذا فی مسلم بلفظ غیرہ ۲/ ۳۱۷۔

۱۰؎ ابوداؤد ۲/ ۶۹۸۔ مشکوٰۃ/ ۴۱۸۔

۱۱؎ رواہ ابوداؤد۔ مشکوٰۃ/ ۴۱۸۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

”جو شخص اندھے جھنڈے کے نیچے لڑے اس طرح کہ عصبیت کی وجہ سے غصے کا اظہار کرے یا عصبیت (قومیت) کی طرف لوگوں کو بلائے یا قومیت (عصبیت) کی بنیاد پر کسی کی مدد کرے، پھر وہ مارا جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی اور جو میری امت کے خلاف تلوار اٹھائے، نیک و بد ہر ایک کو قتل کرے، نہ مومن کے ایمان کا لحاظ کرے (کہ اس کو قتل نہ کرے) نہ کسی عہد والے کے عہد کو پورا کرے، اس کا مجھ سے کوئی تعلق ہے، نہ میرا اس سے تعلق ہے[12]۔“

سیدنا حضرت واثلہ ابن اسقع کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

یا رسول اللہ، عصبیت کیا چیز ہے؟

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عصبیت یہ ہے کہ تم ظلم پر اپنی قوم کی حمایت کرو۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص ہم (مسلمانوں) میں سے نہیں ہے جو لوگوں کو عصبیت کی دعوت دے، یعنی لوگوں کو کسی ناحق معاملہ میں حمایت کرنے پر آمادہ کرے، نہ وہ شخص ہم میں سے ہے جو عصبیت کے سبب جنگ کرے؛ اسی عصبیت کی حالت میں مر جائے[13]۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس کو چاہیے مسلمان بھائی پر ظلم نہ کرے، نہ اس کی مدد کرنا چھوڑے اور نہ اس کو حقیر سمجھے، اور تقویٰ تو یہاں ہوتا ہے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ کہا اور اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ فضیلت کا مدار تو تقویٰ ہے۔ آدمی کے برا ہونے کے لیے اتنا کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو ذلیل سمجھے ہر مسلمان کا مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون بہانا (ناحق) اس کا مال (لینا یا ضائع کرنا) اور اس کی آبرو ریزی کرنا[14]۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا: یا رسول اللہ، کیا اپنی قوم سے محبت کرنا بھی تعصب و عصبیت ہی کا حصہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، (یعنی قوم سے محبت کرنا کوئی برا نہیں اور نہ یہ تعصب کہلاتا ہے، بلکہ) عصبیت یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم کی ظلم پر مدد کرے[15]۔

---

[12] مسلم ۲/ ۱۲۸۔

[13] ابوداؤد۔

[14] مسلم ۲/ ۳۱۷۔

[15] رواہ احمد وابن ماجہ۔ مشکوٰۃ/ ۴۱۸۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ان واضح ارشادات کے باوجود مسلمانوں کا قبیلہ پرستی میں مبتلا رہنا خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہے۔ ہمیں اس جرم سے توبہ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ دنیا و آخرت کا وبال ہمارا منتظر ہے، ہمیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

فقہاے کرام نے چار طرح کے لوگوں کی نماز جنازہ پڑھنے کو ناجائز لکھا ہے، جن میں ایک تعصب کی وجہ سے لڑائی کرتے کرتے مرجانے والا بھی ہے:

۱۔ امام عادل کے خلاف اسلامی حکومت میں بغاوت کرنے والے؛

۲۔ ڈاکو؛

۳۔ تعصب کی وجہ سے آپس میں لڑنے والے دو گروپ اور اسی حالت میں قتل ہو جائیں؛

۴۔ شہر میں ہتھیار وغیرہ کے ذریعے سے کسی بے گناہ کے قتل کے درپے ہونے والا یا مال غصب کرنے والا اور اسی حالت میں قتل ہو جائے۔ ان بدقسمت لوگوں کو نہ غسل دیا جائے گا اور نہ نماز پڑھی جائے گی، تاہم یہ حکم اسی وقت ہوگا جب کہ یہ حضرات بغاوت کرتے ہوئے، ڈاکا ڈالتے ہوئے، تعصب کی خاطر قتال کرتے ہوئے، شہر میں ہتھیار وغیرہ کے ذریعے سے کسی بے گناہ کے قتل یا مال لینے کے فراق میں قتل ہو جائیں، ورنہ اگر مذکورہ افعال کے صدور سے قبل یا بعد میں موت واقع ہو تو ان کو غسل بھی دیا جائے گا اور نماز بھی پڑھی جائے گی۔[16]

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

لیکن یہ حکم چونکہ شہدا کا ہے کہ ان کو غسل نہ دیا جائے تو شہدا کی مشابہت سے بچانے کے لیے ان لوگوں کو غسل دیا جائے گا اور نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی اور اسی پر فتویٰ ہے[17] اور ان کی نماز نہ پڑھنا اس لیے تاکہ لوگوں پر ان کی ذلت واضح ہو جائے اور سبق حاصل کریں کہ یہ افعال قبیح اور قابل احتراز ہیں۔[18]

یہ سامنے کی حقیقت ہے کہ ہمارے ذات پات کے نظام میں بعض ذاتوں کو اعلیٰ اور بعض کو ادنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے بہت سے لوگ دوسری ذات میں شادی کرنا پسند نہیں کرتے۔ بعض حضرات اپنے بیٹوں کی شادیاں تو دوسری ذاتوں میں کر دیتے ہیں، لیکن بیٹیوں کی شادیاں صرف اپنی ہی ذات میں رکھتے ہیں۔

مختلف پیشوں کے بارے میں ہمارے یہاں گھٹیا ہونے کا تصور موجود ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر محنت کشوں

۱۶؎ درمختار علی ردالمحتار (شامی) ۱/ ۶۴۲-۶۴۳۔

۱۷؎ تاتارخانیہ ۱/ ۶۰۷۔ ردالمحتار ۱/ ۶۴۳۔

۱۸؎ شامی ۱/ ۶۴۲۔

اور ہاتھ سے کام کرنے والے پیشوں کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ دیہی معاشرے میں جاگیردار اور زمین دار اپنے ملازمین کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ شہری معاشرے میں اگرچہ ملازمین کے ساتھ اتنا حقارت آمیز سلوک نہیں ہوتا، لیکن انھیں بہرحال مالکوں اور اعلیٰ افسران سے کم تر ہی تصور کیا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ایک دولت مند جاہل متکبر کی گاڑی کی تصویر سوشل میڈیا پر گردش کرتی دیکھی، جس کی ڈگی میں اس نے اپنی گھریلو ملازمہ کو ڈالا ہوا تھا۔ گاڑی میں جگہ ہونے کے باوجود متکبر انسان نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس کی گاڑی کی سیٹ پر یہ غریب و بے بس ملازمہ بھی بیٹھ سکے۔

ہم لوگ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو بھی خود سے حقیر سمجھ کر ان کی توہین کرتے ہیں اور بسا اوقات ان سے تحقیر آمیز رویہ رکھتے ہیں۔ بالکل اسی قسم کا سلوک مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔

رنگ کی بنیاد پر بھی امتیاز رکھا جاتا ہے اور سیاہی مائل جلد رکھنے والوں کو طعنے دیے جاتے ہیں۔ اس بنیاد پر امتیاز ہماری نسبت مغربی اقوام میں زیادہ پایا جاتا تھا، لیکن اب ان لوگوں نے کافی حد تک ان برائیوں سے خود کو نجات دے دی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

زبان اور صوبے یا علاقے کی بنیاد پر بھی ہمارے ہاں خاصا تعصب پایا جاتا ہے اور ایک علاقے یا صوبے کا فرد دوسروں کا مذاق اڑاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمارے بعض شہروں، جیسے کراچی میں تو یہ تعصب ایک زمانے میں اتنے عروج پر پہنچ گیا کہ اس کے نتیجے میں ہزاروں افراد لسانی فسادات کا شکار بنے۔ افسوس و شرم کا مقام ہے کہ اس قسم کی جہالت خود کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی اور معلوم نہیں کیا کیا دعوے کرنے والی قوم میں پائی جاتی ہے۔ اور یہ سب اس دور میں کہ جب دنیا نے ایسی تمام جہالتیں ترک کر کے انسان کو انسان کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ کل تک امریکا میں سیاہ فام لوگوں کو حقیر سمجھا جاتا تھا، پھر وہ وقت بھی آیا کہ باراک حسین اوبامہ کی صورت میں سیاہ فام آدمی امریکا میں صدارت کے منصب پر فائز ہوا۔ ہمارے ہاں تو اکثریتی قبیلے والے اقلیتی قبائل کو ووٹ دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں
یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو تم سبھی کچھ ہو بتاؤ مسلمان بھی ہو

نقد و نظر

محمد حسن الیاس

قصر نماز

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسلام کی عبادات میں سے نماز اہم ترین عبادت ہے۔ اِس عبادت کے لیے جو اعمال شریعت میں مقرر کیے گئے ہیں، وہ اجماع اور تواتر سے ثابت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے اہتمام سے اِن اعمال کو ادا کیا اور لوگوں کو تلقین فرمائی کہ نماز اِس طرح پڑھو، جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ اِس کے اوقات اور اعمال متعین ہیں، البتہ بعض حالات میں اِن میں تخفیف کی اجازت دی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

''تم لوگ (اِس جہاد کے لیے) سفر میں نکلو تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز میں کمی کر لو، اگر اندیشہ ہو کہ منکرین تمھیں ستائیں گے، اِس لیے کہ یہ منکرین تمھارے کھلے دشمن ہیں۔'' (النساء ۴: ۱۰۱)

قرآن مجید نے اِس آیت میں ایک خاص صورت حال کو سامنے رکھ کر نماز میں کمی کی اجازت دی ہے، جسے اصطلاح میں ''قصر'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مسلمان امت نے جس طرح نماز کے اعمال رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے، اُسی طرح قرآن مجید نے جب اِس میں کمی کی اجازت دی تو رکعات میں کمی کے طریقے کو بھی آپ کی سنت سے اخذ کیا ہے۔

قصر نماز کے حوالے سے قرآن مجید کی اِس ہدایت پر غور کیا جائے تو دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

پہلا سوال یہ ہے کہ سورۂ نساء کی یہ آیت ایک مخصوص صورت حال میں نماز کو قصر کرنے کی اجازت کیوں دے

رہی ہے؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ ہم سب جانتے ہیں کہ جنگ کے موقع پر انسان کو لڑائی کے لیے متنبہ رہنا پڑھتا ہے، اِس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اُس کا سارا وقت اور توجہات اِسی مقصد کے لیے متعین رہیں۔ اِسی طرح جنگ کے لیے سفر پر نکلتے وقت انسانی نفسیات اقدام، دفاع اور خوف کی کیفیات میں ہوتی ہے۔ یہ کوئی عام حالت نہیں ہوتی، اِس صورت حال میں افراتفری، پریشانی اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جس میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ دوسرے کاموں میں زیادہ وقت صرف نہ ہو اور انسان کو سفر کا اصل مقصد پوری طرح مستحضر رہے۔ قرآن مجید کے مطابق چونکہ نماز کی دین میں اِس قدر اہمیت ہے کہ جنگ کے خطرات میں بھی کوئی مسلمان اُسے نظر انداز نہیں کر سکتا، اس لیے اِس صورت حال میں خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے اِس میں کمی کا اعلان کر دیا ہے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنگ کے سفر میں افراتفری، پریشانی اور آپادھاپی سے جو اندیشہ کی صورت حال پیدا ہوتی ہے، اگر یہی کیفیت بعض دوسرے کاموں سے پیدا ہو جائے تو کیا اِن میں بھی نماز میں کمی کی رخصت دی جانی چاہیے؟ عقل کہتی ہے کہ یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے، اِس لیے کہ رخصت اگر کسی وجہ سے دی گئی ہے تو وہ سبب جہاں پایا جائے گا، رخصت کا متقاضی ہوگا۔ لہٰذا اسی عقلی اور فطری اصول کو سامنے رکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس آیت سے قیاس کیا ہے کہ عام سفروں میں اضطراب، افراتفری اور پریشانی سے اندیشہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، لہٰذا وہاں بھی نماز کو قصر کیا جا سکتا ہے۔

آپ کا اِس رخصت کا مماثل صورت حال پر اطلاق متعدد روایات میں نقل ہوا ہے۔

سیدنا ابن عباس کا بیان ہے:

عن ابن عباس رضي اللّٰه عنه، قال: خرج رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه و سلم من المدينة إلی مكة، لا يخاف إلا اللّٰه رب العالمين فصلی ركعتين حتی رجع.	''ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینے سے مکہ کی جانب نکلے، اللہ کے علاوہ کسی کا خوف نہ تھا، تب بھی ہم نے لوٹنے تک دو دو رکعات پڑھیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی اِس آیت پر قیاس کر کے اِس رخصت میں اندیشے کے دیگر امکانات میں کیوں تسلیم کیا؟ اس کی وجہ سیدنا عمر نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود دریافت کی تھی۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ يَعْلَى بْنِ أُمَيَّةَ، قَالَ: قُلْتُ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ (لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا) مِنَ الصَّلَاةِ اِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوْا، فَقَدْ أَمِنَ النَّاسُ، فَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ: عَجِبْتُ مِمَّا عَجِبْتَ مِنْهُ، فَسَأَلْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذٰلِكَ، فَقَالَ: ”صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ بِهَا عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهُ“. (مسلم، رقم ٦٨٦)

”یعلی بن امیہ سے روایت ہے کہ میں نے سیدنا عمر کو یہ آیت پڑھ کر سنائی: ”تم لوگ (اِس جہاد کے لیے) سفر میں نکلو تو تم پر کوئی حرج نہیں کہ نماز میں کمی کرلو، اگر اندیشہ ہو کہ منکرین تمھیں ستائیں گے“، اِس کے بعد اُن سے کہا: اِس وقت تو لوگ امن کی کیفیت میں آ گئے تھے، تو عمر رضی اللہ نے کہا: جس بات پر تمھیں تعجب ہوا ہے، مجھے بھی ہوا تھا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس حوالے سے پوچھا، اِس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اللہ کی عنایت ہے جو اُس نے تم پر کی ہے، سو اللہ کی اِس عنایت کو قبول کرو۔“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے 'اِنْ خِفْتُمْ' (اگر تمھیں اندیشہ ہو) کی شرط کے ساتھ جو صورت حال بیان کی ہے، اُس کی کوئی مماثل صورت حال کہیں اور پائی جائے گی، جس کے نتیجے میں اضطراب، افراتفری، پریشانی، زحمت یا آپادھاپی کا کوئی پہلو سامنے آئے تو وہاں بھی رخصت دی جا سکتی ہے۔ مثلاً آپریشن کے دوران میں ڈاکٹر کی نماز قضا ہونے کا اندیشہ ہو یا پھر کہیں آگ بجھانے کی کیفیت ہو اور کارکن نماز پڑھنا چاہیں تو وہاں بھی انسان یقیناً نماز قصر کر سکتا ہے۔

ہمارے عہد کے فاضل محقق سید متین احمد صاحب نے سورۂ نساء کی اِس آیت سے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے قیاس کو فکر فراہی میں الفاظ کی حاکمیت کی بحث کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”یہاں چونکہ 'الفاظِ قرآن کی حاکمیت' سے صراحتاً عام سفر میں نماز کے قصر کا حکم مستنبط ہوتا نظر نہیں آتا، اس لیے غامدی صاحب بھی مجبور ہوئے ہیں کہ ”روایتوں“ اور ”قیاس“ کی طرف رجوع کریں۔ یہاں وہ اصل سوال لوٹ کر آتا ہے کہ خبرِ واحد کیا دین میں کسی نئے حکم کا اضافہ کر سکتی ہے یا نہیں؟“

فاضل محقق کی خدمت میں عرض ہے کہ عام سفر میں قصر نماز کی رعایت کو ثابت کرنے کے لیے غامدی صاحب نے اپنی تفسیر ”البیان“ اور دین پر اپنی کتاب ”میزان“ میں آیت سے الگ ہو کر روایت کا سہارا نہیں لیا، بلکہ یہ بتایا ہے کہ **رسالت مآب کا جو عمل ہم تک نقل ہوا ہے، وہ قرآن مجید کی اِسی آیت سے قیاس پر مبنی ہے۔** اگر رسالت مآب

صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قیاس ہم تک نقل نہ ہوتا، تب بھی اہل علم اِس آیت کو پڑھ کر قیاس کر سکتے تھے، اِس صورت میں یہ اُن کا اجتہاد ہوتا، بالکل ایسے ہی، جیسے شریعت کی باقی ہدایات میں علما اشتراک علت کے اصول پر احکام کا اطلاق کرتے ہیں۔ اِس پورے عمل کا قطعاً کوئی تعلق الفاظ کی حاکمیت کی بحث سے نہیں ہے۔ فاضل محقق کا سوال اُس وقت قابل اعتنا ہوتا، جب یہ کہا جاتا کہ قیاس کا یہ عمل آیت کے الفاظ میں مذکور سبب سے بے نیاز ہو کر کیا جائے گا۔ فکر فراہی کا تو اصرار ہی یہی ہے کہ قرآن مجید سے جو کچھ بھی اخذ کیا جائے گا، اُس کا واحد راستہ اُس کے الفاظ ہیں۔ الفاظ کلام میں ڈھل کر اگر کوئی علت یا سبب ہم تک منتقل کر رہے ہیں تو ہم اُس کا اطلاق مماثل صورت حال پر کر سکتے ہیں۔ لہٰذا بتانا یہ چاہیے کہ قرآن مجید کے الفاظ اِس سبب کو بیان نہیں کر رہے جس کا اطلاق کیا جا رہا ہے۔

فاضل محقق اِس کے بعد لکھتے ہیں:

دوسرا سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب نے جو یہ فرمایا کہ:

''نبی ﷺ نے اپنے سفروں کے عام سفروں کی پریشانی، افراتفری اور آپا دھاپی کو بھی اس پر قیاس فرمایا اور ان میں بالعموم قصر نماز ہی پڑھی ہے۔'' تو کیا اس سے اصولی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قیاس، جیسا کہ اصول فقہ کی تعبیر ہے، ''مُظہِر حکم' (حکم کو ظاہر کرنے والا) ہے۔ جب یہ مظہِر حکم ہوا (جیسا کہ غامدی صاحب کی تصریح بھی بظاہر لگتا ہے۔) تو فقہ اسلامی کا مہتم بالشان ذخیرے کا بڑا حصہ جب اسی اصول سے ماخوذ ہے تو اسے محض انسانی فہم قرار دے کر کیوں رد کر دیا جائے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فاضل محقق نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ قرآن مجید کی ہدایات پر قیاس کرنے کی یہ روایت حکم کے مضمرات اور نئے مسائل میں اطلاقات کو جاننے کی کوشش ہے، جس کی بہت شان دار روایت ہماری فقہ میں نظر آتی ہے، اِسے انسانی فہم کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے، اِس پر عرض ہے کہ کیا غامدی صاحب قیاس اور اجتہاد کے اس سارے عمل کو انسانی فہم قرار دے کر رد کرتے ہیں؟ اجتہاد کے موضوع پر غامدی صاحب کے آرٹیکل کے اِس حصہ کو دیکھنا چاہیے، جہاں اِس سوال کا واضح جواب موجود ہے۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''دین کا تنہا ماخذ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ آپ سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے: ایک قرآن، دوسرے سنت۔ آپ کے بعد اب یہ اِنھی دو چیزوں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اِن کے علاوہ تبعاً اگر کوئی چیز خدا کے منشا تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ اجتہاد ہے۔ اِس سے ہم بہت سی دوسری چیزوں کے ساتھ اُن احکام کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جو

براہ راست نصوص میں بیان نہیں ہوئے، لیکن اپنی نوعیت کے لحاظ سے اُنھی کے اطلاقات ہیں جو لوگوں کی راے اور فہم پر چھوڑ دیے گئے ہیں۔ قیاس اِسی کی ایک قسم ہے۔ قرآن میں اِس کے لیے استنباط کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے جو چیز وجود میں آتی ہے، اُسے فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس کی ابتدا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہادات سے کر دی تھی۔ اخبار آحاد کا ایک بڑا ذخیرہ اِسی کا بیان ہے۔ آپ کے بعد صحابہ و تابعین نے بھی یہ روایت قائم رکھی۔'' (مقامات ۱۵۶)

غامدی صاحب کا یہ بیان بتا رہا ہے کہ قرآن مجید کی کسی ہدایت کو سامنے رکھ کر قیاس کیا جائے تو یہ روایاتِ آحاد، قیاس اور خارج کو بیچ میں لا کر ''کلامِ الٰہی پر تہمت دھرنا'' نہیں ہے، بلکہ کسی مماثل صورت حال میں خدا کی منشا کو جاننے کا عمل ہے، یہ عمل جس طرح اِس آیت کے الفاظ سے بے نیاز ہو کر نہیں کیا جا سکتا، اُسی طرح کرنے والا، اگر پیغمبر نہیں ہے تو اُس کے اجتہاد سے اختلاف کی گنجایش باقی رہتی ہے۔ یہ صرف پیغمبر ہیں، دین کے معاملے میں جن کے اجتہادات کو خدا کی تصویب حاصل ہوتی ہے۔ انسان اپنے علم کی حد تک قیاس و استنباط کر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر بحث ہونی ہے تو اِسے انسانی کام سمجھتے ہوئے ہونی ہے۔ اور اگر بحث کرنی ہے تو اِس قیاس کے صحیح یا غلط پر کرنی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

''...روزہ اِس احساس کو آدمی کے ذہن میں پوری قوت کے ساتھ بیدار کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ نفس کے چند بنیادی مطالبات پر حرمت کا قفل لگتے ہی یہ احساس بندگی پیدا ہونا شروع ہوتا اور پھر بتدریج بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ روزہ کھولنے کے وقت تک یہ اُس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے۔'' (میزان، جاوید احمد غامدی ۳۶۳)

ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی*

کیا جاوید احمد غامدی امت مسلمہ کی اکثریت کی تکفیر کرتے ہیں؟

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

[نادر عقیل انصاری کے کھوٹے فتوے کا تجزیہ]

فی زمانہ امت مسلمہ جن شدید داخلی مشکلات سے دوچار ہے، ان میں تکفیر کے فتنہ نے بڑا رول ادا کیا ہے۔ بات تلخ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں، مسلکوں، مشربوں اور جماعتوں نے ایک دوسرے کے خلاف تکفیر و تفسیق کا بے محابا اور بے مہار استعمال کیا ہے اور آج بھی اس میں کوئی کمی ـــــ بعض اہل افتا اور اہل مدارس کی روش کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑ رہا ہے کہ ـــــ نہیں آ رہی ہے۔ اس کی دسیوں مثالیں دی جا سکتی ہیں، لیکن سر دست اس کو کسی دوسرے موقع کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ فتنۂ تکفیر میں سب سے زیادہ استعمال موجودہ رائج مذہبی بیانیہ کا ہوتا ہے۔ جو مسئلہ کو

---

* ریسرچ ایسوسی ایٹ مرکز برائے فروغ تعلیم و ثقافت مسلمانان ہند، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ انڈیا۔

تکفیر تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ باقاعدہ دہشت گردی اور قتل وقتال کی طرف لے جاتا ہے (دیکھیے: ڈاکٹر عرفان شہزاد، جہادی بیانیہ کی تشکیل میں روایتی مذہبی فکر کا کردار، الشریعہ، مئی ۲۰۱۷ء)۔

اسی داخلی صورت حال کی تبدیلی کے پیش نظر کچھ عرصہ پہلے جناب جاوید احمد غامدی نے اپنا ایک مذہبی بیانیہ پیش کیا جس میں انھوں نے فتنۂ تکفیر پر بھی اظہار خیال کیا کہ ہم کو دوسروں کی گم راہی پر متنبہ کرنے اور ان پر تنقید کرنے کا تو حق ہے، مگر ان کی تکفیر کا نہیں۔ غامدی صاحب کا موقف عصر حاضر کے تناظر میں بالکل درست اور مطابقِ حق تھا۔ لیکن وہ اس مسئلہ کو کسی فقہی تناظر میں نہیں لے رہے تھے، مگر ان کے ناقدین نے عموماً اس چیز کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کو لے کر تکفیر کے جواز وعدم جواز کی بحث چھیڑ دی جو بالکل غیر متعلق تھی۔ لیکن بات یہیں رکی نہیں، ناقدینِ غامدی کے سالار طائفہ جناب نادر عقیل انصاری نے جوابی پلٹ وار کیا، جس میں، افسوس کہ وہ علمی متانت وسنجیدگی کو بھی کھو بیٹھے اور ہزیان گوئی پر اتر آئے۔ چنانچہ وہ یہ دور کی کوڑی لے کر آئے کہ جناب جاوید احمد غامدی تو خود امت مسلمہ کی اکثریت کی تکفیر کرتے ہیں۔

محترم انصاری صاحب لکھتے ہیں:

''ایک مسئلہ یہ کہ خود جاوید احمد غامدی صاحب نے امت کے سواد اعظم کی تکفیر کی ہے۔ جاوید احمد غامدی صاحب نے جب امت کے عظیم قائدین، علماء، صوفیاء، اور مجتہدین ومجددین سے اپنا اختلاف بیان کیا تو یہ ان کا حق تھا۔ لیکن وہ یہاں نہیں رکے۔ انہوں نے فقط یہ نہیں کہا کہ میں ان کی دینی تعبیرات سے اختلاف رکھتا ہوں، یہ نہیں کہا کہ یہ میری اجتہادی رائے ہے، یہ نہیں کہا کہ صوفیاء کی رائے میں صحت، اور میری رائے میں خطا کا احتمال ہے! اس کے بجائے وہ متشددانہ انتہا پسندی کی آخری حدوں پر پہنچ گئے اور انہیں دینِ اسلام کے دائرے ہی سے نکال دیا۔ لکھتے ہیں: ''[تصوف] اُس دین کے اصول ومبادی سے بالکل مختلف ایک متوازی دین ہے، جس کی دعوت قرآن مجید نے بنی آدم کو دی ہے۔'' (برھان، صفحہ:۱۸۱)۔ ''اس باب میں قران مجید کی اس صراط مستقیم سے انحراف کے بعد، جس میں نہ ممکن کے لیے وجود کا اثبات کوئی شرک ہے، اور نہ موجود یا مشہود صرف اللہ ہی کو قرار دینا توحید کا کوئی مرتبہ ہے، اہل تصوف نے جو راہ اختیار کی ہے، یہ سب اسی کے احوال ومقامات ہیں۔'' (برھان، ۱۸۸)۔ ''اپنشد، برہم سوتر، گیتا، اور فصوص الحکم کو اس دین میں وہی حیثیت حاصل ہے جو نبیوں کے دین میں تورات، زبور، انجیل، اور قرآن [مجید] کو حاصل ہے.'' (برھان، ۱۹۲)۔ صوفیاء کرام نے ''حریم نبوت میں نقب'' لگائی ہے (برھان، ۱۹۹)۔ ''ایک پوری شریعت ہے جو خدا کی شریعت سے آگے اور قرآن وسنت سے باہر، بلکہ ان کے مقاصد کے بالکل خلاف ان اہلِ تصوف نے طریقت کے نام سے رائج کرنے کی کوشش کی ہے.'' (برھان، ۲۰۹)۔ ''اسلام

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کے مقابلے میں تصوف ایک عالمگیر ضلالت ہے۔'' (برھان، ۱۹۲)

ہم اس سلسلہ میں کچھ باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں:

پہلی بات یہ کہ جناب انصاری صاحب نے محترم غامدی صاحب کی عبارتوں کے ٹکڑے ان کی کتابوں سے کانٹ چھانٹ کر نقل کیے ہیں۔ کوئی بھی فقرہ اپنے سیاق وسباق کے ساتھ پورے معنی دیتا ہے، اس لیے انصاف کی بات تو تب ہوتی جب آپ پوری عبارتیں نقل کرتے۔ ان فقروں میں غامدی صاحب نے تصوف پر شدید تنقید فرمائی ہے اور اس تنقید میں وہ بالکل حق بجانب ہیں اور صرف غامدی صاحب ہی نے نہیں، بلکہ کئی اور اہل علم، بلکہ ائمۂ کرام نے بھی تصوف پر شدید تنقید کی جس کو ہم آگے نقل کریں گے۔ غامدی صاحب کے ان فقروں کو آپ بار بار پڑھیں ذرا بھی خیال نہیں گزرے گا کہ یہ باتیں کہنے والا اہل تصوف کی تکفیر کر رہا ہے، زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا انداز بیان ذرا سخت ہو گیا ہے، مگر جناب انصاری صاحب زور زبردستی ان سے تکفیر کا مطلب کشید کرتے ہیں۔ دیکھیے کس طرح، فرماتے ہیں:

''جو ان اوصاف کا حامل ہو وہ دائرہ دین سے خارج ہوتا ہے۔ یہی تکفیر ہے۔ بلکہ یہ تکفیر سے اشدّ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ یہی قبول کیا جائے گا۔ اس کے مقابل، اس سے مختلف، اور اس کے متوازی ادیان بھی موجود ہیں جیسے یہودیت، عیسائیت، ہندومت، وغیرہ۔ لیکن اسلام کا دعویٰ ہے کہ فقط وہی حق ہے، باقی ادیان باطل ہیں، اور مآل کار ان کے پیروکار آخرت میں فلاح نہ پا سکیں گے''۔...صراطِ مستقیم ایک ہی ہے، اور وہ دینِ اسلام ہے۔ اب اگر صوفیاء نے اس صراط مستقیم کو چھوڑ دیا ہے، تو وہ کافر ٹھہرے۔ جب غامدی صاحب ائمۃ المسلمین (ائمۃ المسلمین کو نہیں صوفیا کو، معروف ائمہ میں کوئی بھی صوفی نہیں تھا (غ) کو اسلام کے متوازی دین کا پیروکار بتاتے ہیں، تو اس کا مطلب تکفیر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ صوفیائے کرام کے بارے میں جاوید غامدی صاحب کا یہ فتویٰ تکفیر کے عام فتاویٰ کے مقابلے میں شدید تر ہے۔ کسی مسلمان فرد یا گروہ کی تکفیر ایک بات ہے، اور تقریباً پوری امت مسلمہ کی تکفیر اس سے کہیں زیادہ شنیع کام ہے۔'' (انصاری صاحب کا یہ مضمون دلیل ڈاٹ کام پر موجود ہے)

اس پوری عبارت میں انصاری صاحب غامدی صاحب کے منہ میں اپنی باتیں ڈال رہے ہیں۔ صوفیا کو کافر آپ بنا رہے ہیں، مجرم غامدی صاحب کو ٹھیرا رہے ہیں! پھر یہ کہ صوفیا پوری امت مسلمہ کس منطق کی رو سے قرار پا گئے؟ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

لیکن ذرا ٹھیریے، ہم آپ کے صغریٰ کبریٰ کا نتیجہ آپ کے سامنے کچھ سوالوں کی شکل میں رکھ رہے ہیں۔

غامدی صاحب اصولاً تکفیر کے قائل نہیں، وہ کہتے ہیں کہ گم راہ فرقوں، جماعتوں یا اشخاص کی گم راہی کی وضاحت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کر دیجیے، آپ کا کام ختم۔ آپ اپنی ذمہ داری سے بری، اب معاملہ ان کے اور اللہ کے مابین ہوگا۔ تصوف اور اہل تصوف کے بارے میں غامدی صاحب کے ارشادات اسی قسم کے ہیں، وہ ان کو علی وجہ البصیرۃ گم راہ سمجھتے ہیں اور اس کے دلائل دیتے ہیں۔ آپ کو ان کے دلائل سے اتفاق نہیں ہے تو آپ اپنے دلائل دے دیجیے اور بس۔ یہی کام اہل علم ہمیشہ کرتے رہے ہیں اور ان کے اس نقد کو کسی نے بھی تکفیر شمار نہیں کیا۔ ذرا غور کیجیے کہ آپ نے جو صغریٰ کبریٰ مرتب کیا ہے، اس کی زد کہاں کہاں پڑے گی۔ سنیے:

مفسرین کی بڑی اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ انسان اللہ کا خلیفہ ہے، لیکن امام ابن تیمیہ کو نہ صرف اس سے اختلاف ہے، بلکہ وہ کہتے ہیں: 'من جعل له خليفة فهو مشرك به' (مجموع الفتاویٰ ۲/۵۵۲)۔ اب آپ کے صغریٰ کبریٰ کو مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن تیمیہ بیش تر مفسرین کی تکفیر کرتے ہیں کہ وہ تو صاف صاف شرک کا لفظ استعمال کر رہے ہیں، غامدی صاحب نے 'شرک' یا 'کفر' کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا!

محدثین کرام نے اہل کلام پر شدید تنقید کی ہے، ان کی کتابیں پڑھنے سے منع کیا ہے، ان کے کلام کو کفریات سے مملو بتایا ہے۔ مثلاً امام احمد بن حنبل، وکیع بن الجراح، یزید بن ہرواں اور امام مزنی کے مطابق خلق قرآن کا دعویٰ کرنے والا کافر ہے، امام بخاری نے تو یہاں تک کہا کہ یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں میں سے ''جہمیہ'' جیسا کافر اجہل میں کسی کو نہیں پاتا، امام احمد کہتے ہیں: 'لا تجالسوا أهل الكلام'، ''اہل کلام کے ساتھ نہ بیٹھا کرو'' (عبد الرحمٰن ابن الجوزی مناقب الامام احمد بن حنبل ۲۱۰)۔

اور اہل کلام میں اہل سنت کی جلیل القدر شخصیات اور ائمہ شامل ہیں تو کیا یہ مانا جائے کہ محدثین متکلمین کی تکفیر کرتے ہیں؟

متکلمینِ اسلام اشعری، ابو منصور ماتریدی، امام غزالی اور رازی نے اہل اعتزال کو مبتدع، گم راہ اور اہل ضلال قرار دیا ہے تو کیا اس کو معتزلہ کی تکفیر (آپ کے صغریٰ کبریٰ کے مطابق) تسلیم کیا جائے؟

وجودی متصوفین اور ان کے امام محی الدین ابن عربی، صدر الدین قونوی اور ان کے متبعین کی ابن تیمیہ اتنے شدید الفاظ میں تنقید و مذمت کرتے ہیں کہ غامدی صاحب کے الفاظ بالکل ہلکے معلوم ہوتے ہیں، صدر رومی کے مسلک کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: 'هو أبعد عن الشريعة و الإسلام'، ''وہ شریعت اور اسلام سے بہت دور ہے''۔ ابن عربی کے ایک دوسرے شاگرد تلمسانی کے بارے میں لکھا ہے: 'و أما الفاجر التلمساني فهو أخبث القوم و أعمقهم في الكفر'، ''فاجر تلمسانی تو صوفیا میں سب سے خبیث اور کفر میں سب سے گہرا اترا ہوا ہے''[1] تو

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کیا اس کو ابن عربی اور ان کے شاگردوں کی تکفیر سمجھا جائے؟

نماز دین کی بنیاد اور اس کا اہم ستون ہے، یہ دین کی جامع عبادت ہے۔ قرون مشہود لہا بالخیر میں یہ تصور ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ کوئی مسلمان نماز چھوڑ بھی سکتا ہے۔ اس کی اہمیت وعظمت کے بارے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں مثلاً: 'الصلاۃ عماد الدین من أقامها فقد أقام الدین و من هدمها هدم الدین'، ''نماز دین کا ستون ہے، جس نے اس کو قائم رکھا، اس نے دین کو قائم رکھا اور جس نے اس کو ڈھا دیا، اس نے دین کو ہی ڈھا دیا''، اور فرمایا: 'لا تترك صلاۃ ممکتوبه متعمدًا فمن ترکها متعمدًا فقد برئت منه الذمة'، ''فرض نماز جان بوجھ کر نہ چھوڑ دینا کہ جس نے اس کو جان بوجھ کر چھوڑ دیا، اس سے اللہ کا ذمہ اٹھ گیا''[2]۔ 'بین العبد و بین الکفر ترك الصلاۃ'، ''بندہ اور کفر کے بیچ نماز کا ترک ہے کہ جس نے نماز ترک کر دی اس نے کفر کر دیا'' (ابوداؤد، رقم ۴۶۷۸)۔

آج امت مسلمہ کی اکثریت نماز کی تارک ہے، اب کوئی شخص یہ احادیث بے نمازی مسلمانوں کے سامنے پیش کرے تو کیا اُس کو کہا جائے گا کہ اس نے ان مسلمانوں کی تکفیر کر دی؟ (ہدم دین اور متوازی دین بنا لینا ایک ہی درجہ کی چیز ہیں)۔

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی خود صوفیاے کبار میں سے ہیں، مگر وحدت الوجود کے شدید ناقد وہ ابن عربی سے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ہم کو فتوحات مدنیہ نے ''فتوحات مکیہ'' سے اور نصوص (شریعت) نے ''فصوص'' (الحکم) سے بے نیاز کر دیا ہے'' ان کے (ابن عربی کے) اکثر کشفی علوم جو اہل سنت کے علوم سے اختلاف رکھتے ہیں، صحت سے دور ہیں، ان کی پیروی یا تو وہ کرے گا جس کا دل بیمار ہے یا مقلد محض''[3]۔ کیا اس کو بھی ابن عربی اور متصوفین کی تکفیر کہیں گے؟

دور کیوں جایئے، خود اقبال ایرانی و مجوسی تصوف کے شدید ناقد رہے ہیں۔ سنیے، کیا فرماتے ہیں:

وکیل امرتسر میں ''اسرار خودی اور تصوف'' کے عنوان سے (۱۵ جنوری ۱۹۶۱ء) ایک مضمون اقبال نے لکھا اس میں وہ لکھتے ہیں: شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قدمِ ارواح، وحدۃ الوجود یا مسئلہ تنزلات ستتہ یا دیگر مسائل جن میں

۱؎ ملاحظہ ہو مولانا ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت ۴/۳ ۷، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ۔

۲؎ مشکوٰۃ المصابیح، ولی الدین تبریزی ۵۹ طبع رشیدیہ دہلی۔

۳؎ مولانا ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت ۱۵۵/۴۔

بعض کا ذکر عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب ''انسان کامل'' میں کیا ہے۔ مذکورہ تینوں مسائل میرے نزدیک مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، مسئلہ قدمِ ارواح افلاطونی ہے، بوعلی سینا اور ابونصر فارابی دونوں اس کے قائل تھے، چنانچہ امام غزالی نے اس وجہ سے دونوں کی تکفیر کی ـــــ تنزلات ستہ افلاطونیت جدید کے بانی پلوٹائنس کا تجویز کردہ ہے ـــــ میرا مذہب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نظام عالم میں جاری وساری نہیں (یہ قدیم ہندو فلسفہ کا جز ہے، غ) بلکہ نظام عالم کا خالق ہے اور اس کی ربوبیت کی وجہ سے یہ نظام قائم ہے، جب وہ چاہے گا اس کا خاتمہ ہو جائے گا ـــــ رونا اس بات کا ہے کہ یہ مسئلہ اسلامی لٹریچر کا ایک غیر منفک عنصر بن گیا ہے اور اس کے ذمہ دار زیادہ تر صوفی شاعر ہیں۔ جو پست اخلاق اس فلسفیانہ اصول سے بطور نتیجہ پیدا ہوتے ہیں ان کا بہترین گواہ فارسی زبان کا لٹریچر ہے''۔

اقبال وحدۃ الوجود کو ہندو فلسفہ سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''مسئلہ انا کی تحقیق وتدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب وغریب مماثلت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ جس نکتۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی اسی نکتۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے ذہن ودماغ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔'' (دیباچہ مثنوی اسرار خودی بحوالہ ترجمان دار العلوم دیوبند ص ۳۵، اپریل۔ جون ۲۰۱۶ء نئی دہلی)۔

اتنا ہی نہیں اقبال مولانا سید سلیمان ندوی کو اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ:

''اس میں ذرا شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے، جس نے عجمیوں کی دماغی آب وہوا میں پرورش پائی ہے۔ آپ کو خیر القرون والی حدیث یاد ہوگی، اس میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میری امت میں تین قرنوں کے بعد سمن (ویظهر فيها السمن) کا ظہور ہوگا...... سمن سے مراد رہبانیت ہے''۔ (اقبال نامہ، حصہ اول ص ۷۸، ۷۹ (مؤرخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۶ء)

محترم جاوید احمد غامدی صاحب جب تصوف کو ایک متوازی دین کہتے ہیں تو کیا یہ دوسرے لفظوں میں اقبال کی ترجمانی نہیں؟

اقبال یہیں نہیں رکتے، بلکہ تصوف کو (ایرانی وعجمی) کو جھوٹا قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''شریعت سے اعراض کا رجحان اسی جھوٹے تصوف کا براہ راست نتیجہ ہے جو عجمی دل ودماغ کی پیداوار ہے حالانکہ شریعت ہی اسلامی معاشرہ کو منظّم ومرتب رکھنے کا واحد ذریعہ ہے''۔

(مقالات اقبال (اردو ترجمہ)، مرتبہ: سید عبدالواحد معینی، آئینۂ ادب لاہور ۱۹۸۸ء، ص ۳۰۰)

اقبال تو یہاں تک گئے ہیں کہ کہتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

''بعض صوفیاء کی نسبت تاریخی شہادت بھی اس امر کی موجود ہے کہ وہ قرمطی تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔''

(خطوط اقبال ص ۱۱۵ بحوالہ ترجمان دارالعلوم دیوبند ص ۳۵، اپریل۔ جون ۲۰۱۶ء نئی دہلی)

ملا اور ملائیت سے بھی اقبال بے زار تھے۔ کہتے ہیں:

دینِ کافر فکر و تدبیر و جہاد ‏ ‏ ‏ دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد

لفظ 'فساد' پر غور کریں اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد کریں: 'وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ' (اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا) (البقرہ ۲: ۲۰۵)، 'ان اللہ لا یحب المفسدین' وغیرہ مختلف آیات کریمہ۔

اقبال مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

وہ زمانہ میں معزز تھے مسلماں ہو کر ‏ ‏ ‏ اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

کیا ترکِ قرآں کفر سے کم ہے؟ اگر آپ میں جرأت ہے تو پھر آپ کہیے کہ اقبال نے بھی امت مسلمہ کی تکفیر کی!!

مولانا مودودی نے تصوف کو ''چنیا بیگم'' کہا (ملاحظہ ہو، تجدید واحیاء دین)۔

حضرت انصاری صاحب مشتے نمونہ ازخروارے، یہ مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اب آپ فرمائیے کہ ہم نے جو سوال کیے ہیں، کیا آپ ان کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، یعنی آپ ان تنقیدوں کو تکفیر کے مترادف مانتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہم آپ کے لیے یہی عرض کر سکتے ہیں:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں ‏ ‏ ‏ مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

اور اگر ایسا نہیں ہے اور ہرگز نہیں ہے تو آپ اپنے بنے ہوئے جال میں پھنس گئے۔ آپ ایسی بندگلی میں پھنسے ہیں کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

اب جہاں تک نفس تصوف پر تنقید کی بات ہے تو اس سلسلہ میں بھی کچھ معروضات پیش کرنا مناسب ہیں۔

تصوف کی اصطلاح سے قرآن وحدیث کے صفحات خالی ہیں۔ قرآن تزکیہ کا ذکر کرتا ہے اور حدیث میں 'احسان' کا لفظ آیا ہے۔ قرون اولیٰ میں تصوف سے مراد اخلاص فی العمل لیا جاتا تھا، جو دین میں مطلوب ہے، لیکن بعد میں تصوف فلسفہ بن گیا۔ تزکیہ واحسان، صالحین کی صحبت اور ذکر اللہ کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ غامدی صاحب جس تصوف کو مسترد کرتے ہیں، یہ وہ تصوف ہے جس میں وحدت الوجود ہے؛ جہاں خالق مخلوق کے درمیان فرق مٹ جاتا ہے؛ جس میں تصور شیخ ہے؛ جس میں 'صلاۃ معکوس' (الٹا لٹک کر نماز پڑھنا ہے)؛ جس میں الا اللہ کی ضربیں ہیں؛ حبس انفاس ہے؛ دردِ لکھی ہے؛ دعائے گنج العرش ہے؛ ختم خواجگان ہے؛ جس میں مزعومہ اولیاء اللہ

کے شجرے پڑھے جاتے ہیں، ان سے برکت حاصل کی جاتی اور بلائیں ٹالی جاتی ہیں؛ جس میں پیرومرشد کومثل خدا سمجھا جاتا ہے۔ مولانا روم (۶۷۳ھ) کے مطابق پیراورذات باری تعالیٰ برابر ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

پیر کامل صورت ظلِ علا   یعنی دید پیر دید کبریا

ہر کہ پیر و ذات را یکجا ندید   نے مریدونے مریدونے مرید

''پیراللہ کے سایہ کی صورت ہےاور پیرکودیکھنا خودذات کبریا کودیکھنا ہے۔ جومرید پیراورذات باری کو''ایک'' نہ دیکھے، وہ مرید ہی نہیں، مرید ہی نہیں، مرید ہی نہیں۔''

جس کی تعلیم ہے: بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید (پیر کہے تو جائے نماز کوشراب سے رنگین کردو)۔ یہ وہ تصوف ہے جس میں منصور کی 'أنا الحق' ہے، امداداللہ مہاجر مکی کا اپنے جبہ کو لپیٹ کر بیٹھنا اور 'ما في جبتي إلا اللّٰه' کہنا ہے۔ جس میں بایزید بسطامی کا ادعائے 'سبحاني ما أعظم شأني' ہے۔ جس میں چلے ہیں، قبروں اورمزاروں پر مراقبے ہیں۔ کوہوں اورغاروں میں پناہ لینا، نفس کشی اورزندگی اوراس کے مسائل سے فرار ہے۔ جس میں بزرگوں کے تصرفات، استمداد بالا رواح اور حلول ہے اور جس میں علم کوحجاب اکبر سمجھا جاتا ہے۔ اگر اِس تصوف کو غامدی صاحب عالم گیر ضلالت کہتے ہیں تو کیا غلط کہتے ہیں! کیاان میں کسی ایک چیز کی سند بھی قرآن میں ہے؟ رسول اللہ کے اسوہ میں ہے، صحابہ کرام کے عمل میں ہے، ائمۂ دین سے ثابت ہے؟ 'قرون مشهود لها بالخير' میں ان میں سے کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ یہ سب بعد کی بدعات ہیں۔ دین کی بنیاد قرآن وسنت ہیں۔ انھی کی سند پر کوئی چیز قبول اوررد کی جائے گی۔ یہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ مسلمانوں کی اکثریت کا عمل کیا ہے اوروہ کن کن کے در پر جھکی ہوئی ہے۔ دین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل کردیا گیا اور کہہ دیا گیا: 'اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا'، ''میں نے تمھارا دین تمھارے لیے مکمل کردیا، اپنی نعمت تم پر پوری کردی اور اسلام کو تمھارے لیے دین منتخب کرلیا'' (المائدہ ۵:۳)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما: كتاب اللّٰه و سنتي'، ''میں نے تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑ دی ہیں جب تک ان سے تمسک کیے رکھو گے گمراہ نہ ہو گے وہ ہیں: اللہ کی کتاب اور میری سنت'' (مسلم، رقم ۲۱۳۷)۔

محترم انصاری صاحب نے اسماعیل شہید کی ''عبقات'' کی پیروی کی دہائی دی ہے۔ حضور، کچھ خبر بھی ہے کہ اسماعیل شہید کا کہنا ہے کہ ''رسول اللہ کے بعد دین میں کسی اضافہ کی بات کہنا کفر ہے'' (پروفیسر ثریا حسین، سرسید اور ان کا عہد: ۲۰۱۵ء ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۶۲)۔

اصلاح ودعوت کی تاریخ میں ہمیشہ منکرات وبدعات پر شدید الفاظ میں تنقید کی جاتی رہی ہے، خصوصاً اگر اس کا تعلق عقائد وعبادات سے ہو، ابن جوزی کی ''تلبیس ابلیس'' دیکھ لیجیے، ابن تیمیہ کی ''اقتضاء الصراط المستقیم ومخالفۃ اصحاب الجحیم'' اور ''منہاج الاعتدال''، نیز ''مجموع الفتاویٰ'' دیکھ لیں۔ مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور شاہ ولی اللہ کے رسائل (جن میں انھوں نے علما، فقہا اور صوفیا کو خطاب کیا ہے) پڑھ لیں۔ ہر جگہ یہ نظارہ دکھائی دے گا۔

انصاری صاحب کی جتنی تحریریں ہم نے پڑھیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کو غامدی صاحب سے اللہ واسطے کا بیر ہے، اس لیے وہ تنقید کے اس اصول کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہیں کہ ''جس موقف پر آپ نقد کر رہے ہیں، اس کو بلا کم وکاست صاحب موقف کے لفظوں میں نقل کریں، تب اس پر نقد کریں۔ اور کسی شخص کا موقف وہی سمجھا جائے گا جو اس نے صراحتاً اپنے کلام میں بتا دیا ہے''۔ وہ اپنے طور پر ایک نتیجہ اخذ کرتے ہیں، زبردستی اور دھاندلی سے اس کو غامدی صاحب کے سر منڈھتے ہیں، پھر اس پر تبصرہ بازی کا شوق فرماتے ہیں۔ یہ علمی نقد نہیں، لفظوں سے کھیلنا ہے، بلکہ 'يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ' کا مصداق ہے۔ اگر بدعات ومنکرات پر اہل علم کے غیظ وغضب کے اظہار کو تکفیر قرار دیا جا رہا ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے بارے میں جناب کی رائے عالی کیا ہے؟ 'من أحدث في أمرنا هذا فهو رد' (متفق علیہ) اور 'كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة و كل ضلالة في النار' (رواہ مسلم)۔ یاد رہے کہ یہ وعید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبوں میں شامل ہوتی تھی، اور آج بھی جمعہ کے خطبوں میں پڑھی جاتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

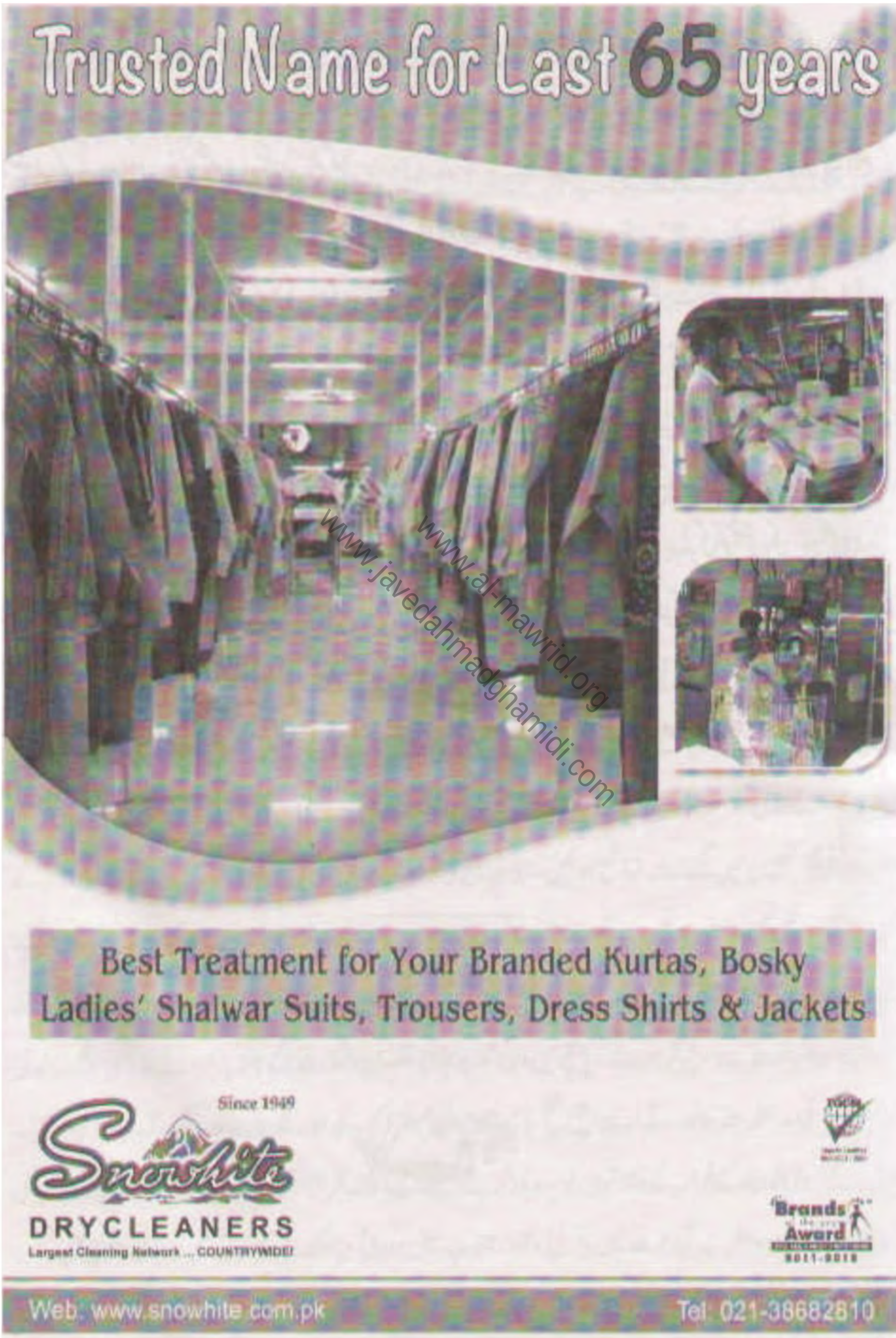

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

Monthly
ISHRAQ
Lahore

May 2018
Vol.30 No.5
Regd. No. CPL- 183

Publisher : javed Ahmad Ghamidi printers : Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore